ربیع الاول ۔ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ

جنوری ۔ مارچ ۲۰۱۵ء

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

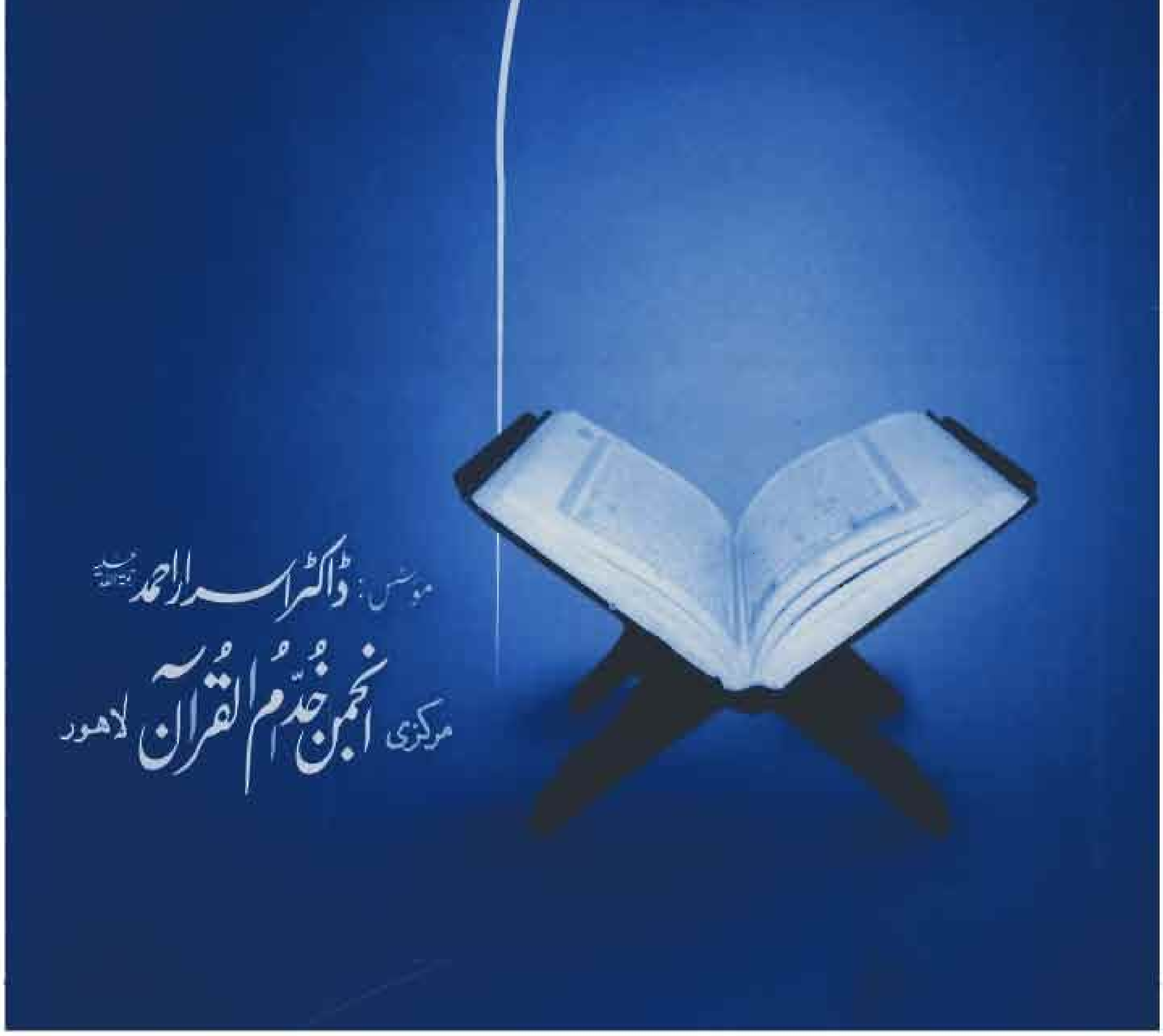

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۴ شمارہ ۱

ربیع الاوّل۔جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ جنوری۔مارچ ۲۰۱۵ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر : حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون : 200 روپے ، فی شمارہ : 50 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

دعوت رجوع الی القرآن میں

''مرکزی انجمن خدام القرآن'' کا کردار و خدمات — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر — 3

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید' مع صرفی ونحوی تشریح — افادات حافظ احمد یارؒ — 17

حکمتِ نبویؐ

مفلس کون؟ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 33

دعوتِ فکر

اسلام اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ چیلنجز؟ — احمد جاوید — 35

حسنِ مُعاشرت

اصلاح معاشرہ کی تعبیر:

مولانا علی میاںؒ کے افکار کی روشنی میں — ڈاکٹر حافظ فدا حسین — 45

تعلیم و تعلّم

اسلامی سکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟ — سید خالد جامعی — 59

کتاب نما

تعارف وتبصرہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 85

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN — Dr. Israr Ahmad — 96

دعوت رجوع الی القرآن میں 'مرکزی انجمن خدام القرآن' کا کردار و خدمات

مورخہ ۱۴ دسمبر ۲۰۱۴ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا بیالیسواں سالانہ اجلاسِ عام قرآن کالج میں واقع قرآن آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں حسب معمول ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عارف رشید نے مرکزی انجمن کی قرآنی خدمات کا جائزہ اور ادارہ کے مختلف شعبہ جات کی کارکردگی کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ صدرِ انجمن جناب ڈاکٹر ابصار احمد نے اپنے خطاب میں مسلم اُمہ کو درپیش چیلنجز پر روشنی ڈالی اور اس حوالے سے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد رحمہٗ اللہ کی برپا کردہ رجوع الی القرآن کی دعوت کے نمایاں خدوخال بیان کیے۔ امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید نے اپنی گفتگو میں مرکزی انجمن و ذیلی انجمن ہائے خدام القرآن کے اہداف و مقاصد کو تنظیم اسلامی کے کام کے حوالے سے واضح فرمایا اور مرکزی انجمن کے کام کو بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہٗ اللہ کے افکار و نظریات کی روشنی میں زیادہ مؤثر انداز میں آگے بڑھانے پر زور دیا۔

رجوع الی القرآن کی یہ دعوت اپنی وسعت، ہمہ گیریت اور اثرات کے حوالے سے اب بحمد اللہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں قرآن اکیڈمیز قائم ہیں اور رجوع الی القرآن کی پکار کو عوام و خواص تک پہنچانے میں اپنا اپنا حصہ ڈال کر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہٗ اللہ کے مشن کو آگے بڑھانے کا کام جاری ہے..... فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ!

رجوع الی القرآن کی اس عاجزانہ خدمت کی صدائے بازگشت اب مقتدرہ علمی حلقوں میں بھی سنائی دی جا رہی ہے۔ چنانچہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں منعقدہ تین روزہ (۱۱ تا ۱۳ نومبر ۲۰۱۴) کانفرنس بعنوان ''پاکستان میں مطالعۂ قرآن کی صورتحال'' میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہٗ اللہ کی اس خدمتِ قرآنی کا حوالہ باندازِ تحسین اور مکرر آتا رہا۔ حکمتِ قرآن کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر نے اس قرآنی تحریک کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا اور مرکزی انجمن خدام القرآن کی خدمات کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ یہ مقالہ سطورِ ذیل میں افادۂ عام کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

برصغیر پاک و ہند میں دعوت رجوع الی القرآن کا تاریخی پس منظر

ڈاکٹر اسرار احمدؒ برصغیر پاک و ہند میں دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک کا آغاز شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خاندان کی مساعی جمیلہ کو قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن مجید کے

فارسی ترجمے اور 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر' کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اُن کے دو صاحبزادوں' شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی الترتیب لفظی و بامحاورہ اُردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں)۔'' (اسرار احمد' ڈاکٹر' دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر' مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور' مارچ ۱۹۹۰ء' ص ۱۱۴)

پس رجوع الی القرآن کی تحریک کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا' لیکن اگلی صدی یعنی انیسویں صدی عیسوی میں رجوع الی القرآن کی یہ دعوت سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مناظروں کے سبب سے دب گئی' یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں پوری شدت کے ساتھ دوبارہ بیدار ہوئی اور اس میں اہلِ حق کے ساتھ کچھ گمراہ فرقوں نے بھی حصہ لیا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ بیسویں صدی عیسوی کے رُبع اوّل کے نمایاں کام کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(۱) سب سے پہلے سرسید احمد خان مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیب الاخلاق' میں تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رک گیا۔ (۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ شائع ہوا۔ (۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔ (۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ شائع ہوا۔ (۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی۔ (۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا' لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہو گئے' لہٰذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہو سکا۔ (۷) ۱۹۰۶ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ (۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۃ النساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے)۔ (۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری [احمدی] کا انگریزی ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا۔ (اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہو گئے!) (۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اُردو تفسیر شائع ہوئی' اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔'' (ایضاً: ص ۱۱۵)

برصغیر پاک و ہند میں دعوت رجوع الی القرآن کے پانچ دھارے

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا کہنا یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں رجوع الی القرآن کی جو عظیم تحریک برپا ہوئی' یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جنہیں ہم متجددین (Modernist) کا نام دے سکتے ہیں اور دوسری طرف روایت کی حفاظت کرنے والے (Traditionalist) اہل علم تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فکر قرآنی کے پانچ سوتوں کا تعارف کرواتے ہوئے ان میں سے ایک دھارے کو گمراہ کن افکار کا منبع اور سرچشمہ سمجھتے ہیں:

''چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک متجددانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سرسید احمد خان مرحوم کی تفسیر کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے..... چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر 'فکر قرآنی' کے میدان میں خواہ مولوی عبداللہ

چکڑالوی کی چکڑالویت ہو خواہ محمد علی لاہوری کی لاہوریت' اور خواہ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کی مشرقیت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیت' یہ سب فکر سرسید ہی کی شاخیں ہیں.....اور ہم انہیں ضلالت وگمراہی کے مختلف رنگ (shades) سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً: ص ۱۱۶۔۱۱۷)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ متجددین کی اس قرآنی فکر کو thesis کا نام دیتے ہیں جس کے ردّعمل میں فطری طور پر ایک anti-thesis وجود میں آیا جو دراصل روایتی علماء کا قرآنی فکر تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیت کی حامل ہیں.....مولانا تھانویؒ کی 'بیان القرآن' پر مبنی تین مزید تفسیریں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر جس میں تقابل ادیان اور خصوصاً بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں' دوسری مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ توجہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتناء کیا گیا ہے۔'' (ایضاً: ص ۱۱۶۔۱۱۷)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ متجددین اور روایت پسند علماء کے قرآنی فکر کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ان دونوں کے ملاپ سے قرآنی فکر کے تین اور مکاتب فکر وجود میں آئے جنہیں ہم synthesis کہہ سکتے ہیں۔ پہلے دھارے کا منبع علامہ اقبالؒ تھے اور اس میں فکری رنگ غالب تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ملت اسلامیہ ہند کے محیط میں 'فکر قرآنی' کے تین سوتے اور پھوٹے جنہیں مجموعی طور پر (synthesis) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علامہ اقبال مرحوم جو معروف ومتداول معنوں میں تو نہ مترجم قرآن تھے نہ مفسرِ قرآن' بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دارالعلوم میں ہوئی تھی' نہ جامعہ اسلامیہ میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومی ثانی' کا ہے۔'' (ایضاً: ص ۱۱۸)

جبکہ دوسرے قرآنی دھارے کا سرچشمہ مولانا ابوالکلام آزادؒ تھے جن کی قرآنی فکر پر دعوتی رنگ غالب تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''برصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسر قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اول ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوئی' تاہم ان کے قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیام حکومت الٰہیہ کے لیے دعوتِ جہاد کا ڈنکا برصغیر کے طول وعرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراج تحسین وصول کر چکے تھے۔'' (ایضاً: ص ۱۱۹)

تیسرے دھارے کے بانی مولانا حمید الدین فراہیؒ تھے کہ جن کے فکر قرآنی پر حکمت اور نظم قرآنی کی گہری چھاپ تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''وہ عظیم شخصیت جس سے برصغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھوٹا' مولانا

حمیدالدین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم وجدید کا حسین ترین امتزاج ان ہی کی ذات میں ہوا۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اُس دور کے چوٹی کے علماء سے فارسی' عربی اور دینی علوم کی تحصیل مکمل کرلی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور فکر جدید کا مطالعہ براہ راست کیا۔ اور پھر ان کی نگاہیں قرآن حکیم پر مرتکز ہوگئیں اور انہوں نے باقی پوری زندگی 'حکمت قرآنی' کی گہرائیوں میں غوطے لگانے میں بسر کردی۔'' (ایضاً: ص ۱۲۱)

مرکزی انجمن خدام القرآن کی تأسیس

مرکزی انجمن خدام القرآن کے بانی ڈاکٹر اسرار احمدؒ انجمن کا تاسیسی پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا آغاز ان کے حلقہ ہائے مطالعہ قرآن سے ہوا جو ۱۹۶۸ء میں قائم کیا گیا تھا:

''۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلیتہً وکاملتہً وابستہ رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں (لگ بھگ چھتیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کرلیا..... اس نے ایک طرف حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر مساعی صرف کردیں.....'' (ایضاً: ص ۱۴۳)

تقریباً تین سال کے مختصر عرصے میں یہ حلقہ ہائے قرآن کافی وسعت اختیار کر گئے اور اس کے لیے فطری طور ایک ادارے کے قیام کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''۷۰۔۱۹۷۱ء کے دوران... ادھر راقم کے حلقہ ہائے قرآن وسعت اختیار کر گئے اور اس کے اعوان وانصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آ گیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی... یہی ضرورت تھی جس کے تحت 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے قیام کا فیصلہ ہوا۔'' (ایضاً: ص ۱۴۴)

اور بالآخر مارچ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''اواخر ۶۷ء سے مارچ ۷۲ء تک گویا مسلسل ساڑھے چار برس راقم کی جملہ توانائیاں اور تمام اوقات دعوت رجوع الی القرآن اور تحریک تعلیم وتعلّم قرآن کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہوئے جس کے نتیجے میں مارچ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور وجود میں آئی۔'' (ایضاً: ص ۱۵۸)

انجمن کے اراکین

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی بنیاد مارچ ۱۹۷۲ء میں رکھی گئی۔ اس کے مؤسس اراکین کی تعداد بیس تھی' جبکہ بعد ازاں اراکین انجمن کو چار حصوں مؤسسین' محسنین' مستقل ارکان اور عام ارکان میں تقسیم کردیا گیا۔ سال ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء کی شائع شدہ رپورٹ کے مطابق انجمن کے حلقہ محسنین کی تعداد ۴۹۶ جبکہ مستقل ارکان ۱۲۲۳ اور عام ارکان ۳۱۳ ہیں۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء' مرتب محمود عالم میاں' مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور' دسمبر ۲۰۱۳ء' ص ۵)

انجمن کے مؤسس اراکین میں اقتدار احمد' بیگم اللہ بخش سیال' ڈاکٹر ایس آئی سرور' جناب خادم حسین' ظہیر احمد خان' ڈاکٹر ظہیر احمد' ڈاکٹر عبد اللطیف خان' بیگم ڈاکٹر عبد اللطیف خان' ڈاکٹر عبد المجید' جناب فیض رسول'

قمر سعید قریشی، میاں محمد رشید، جناب محمد عقیل، شیخ محمد یٰسین، ڈاکٹر محمد یقین، مقصود احمد اختر، میاں منظور الحق، نصیر احمد ورک، ڈاکٹر نور الٰہی اور وقار احمد قریشی شامل ہیں۔ (دس سالہ رپورٹ مرکزی انجمن خدام القرآن مارچ ۱۹۷۲ تا دسمبر ۱۹۸۳ء، مرتب قاضی عبدالقادر، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ص ۸۔۹)

انجمن کے قیام کا مقصد

مرکزی انجمن خدام القرآن کے قیام کا مقصد انجمن کی جملہ مطبوعات کے آخری صفحہ پر ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے:

''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کا مقصد منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ علمی سطح پر تشہیر و اشاعت ہے تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے اور اس طرح اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی کی راہ ہموار ہو سکے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہ''

انجمن کی قرارداد تاسیس کے وقت اس کے مؤسس اور محسن اراکین کی طرف سے اس کے قیام کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے، وہ درج ذیل ہیں:

''چونکہ ہمیں اس امر کا شدید احساس ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبہ دین حق کے دورِ ثانی کا خواب امت مسلمہ میں تجدید ایمان کی عمومی تحریک کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے لازم ہے کہ اوّلاً منبع ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے... ہم چند خادمانِ کتابِ مبین 'مرکزی انجمن خدام القرآن' کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف کی رہنمائی میں مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے کوشاں رہے گی: ۱۔ عربی زبان کی تعلیم و ترویج۔ ۲۔ قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق۔ ۳۔ علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت۔ ۴۔ ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّمِ قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں۔ ۵۔ اور ایک ایسی 'قرآن اکیڈمی' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے۔'' (دستور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۔۱۸)

انجمن کی تنظیم، دستور اور نظام العمل

انجمن کی ہیئت ایک صدر اور ایک مجلس منتظمہ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ تاحیات انجمن کے صدر رہے اور ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر ابصار احمد، سابق چیئرمین شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی، انجمن کے صدر ہیں۔ شروع میں قواعد و ضوابط کی رو سے ایک مجلس منتظمہ قائم کی گئی کہ جس میں اراکین کے چاروں حلقوں سے مناسب نمائندگی لی گئی۔ ۱۹۸۰ء تک مجلس منتظمہ بارہ ارکان پر مشتمل تھی جبکہ بعد ازاں ان کی تعداد چودہ کر دی گئی۔ (دس سالہ سالانہ رپورٹ: ص ۱۴۔۱۵)

۱۹۹۴ء میں مجلس منتظمہ کی جگہ ایک مجلس شوریٰ اور ایک مجلس عاملہ بنائی گئی۔ مجلس شوریٰ انجمن کا پالیسی ساز اور نگران ادارہ ہے جو انجمن کے بنیادی فیصلے کرتا ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد ۲۵ ہے جو منتخب ہوتے ہیں۔ مجلس

عاملہ انجمن کا تنفیذی ادارہ ہے اور مجلس شوریٰ کو جواب دِہ ہے۔ مجلس عاملہ اعزازی ناظمین پر مشتمل ہوتی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں ان ناظمین کی تعداد ۱۲ تھی اور ان میں سے تین ناظمین یعنی ناظم اعلیٰ، ناظم بیت المال اور داخلی محاسب کا شوریٰ کے اراکین میں سے ہونا لازم ہے۔ ان تین کے علاوہ نو (۹) ناظمین میں معتمد، ناظم نشر و اشاعت، ناظم بیرون ملک، ناظم قرآن کالج، ناظم شعبہ سمع و بصر، ناظم بزم ہائے خدام القرآن، ناظم شعبہ خط و کتابت کورس، ناظم تعمیرات و مرمت اور ناظم شعبہ انگریزی شامل ہیں۔ (دستور مرکزی انجمن خدام القرآن، ص ۳۸۔۴۳)

سابقہ دستور پر نظر ثانی کرتے ہوئے ۱۹۹۵ء میں انجمن کے لیے ایک جامع دستور بھی تشکیل دیا گیا ہے اور اس وقت سے جملہ معاملات اس کے مطابق چلائے جا رہے ہیں۔

ذیلی انجمنوں کا قیام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے منہج پر ملک بھر میں کئی ایک ذیلی انجمنیں بھی قائم کی گئی جو بفضل اللہ تعالیٰ اپنے حلقوں میں قرآن مجید کی تعلیم و تعلّم میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔

۱۹۸۶ء میں انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کے تحت قرآن اکیڈمی ڈیفنس اور قرآن اکیڈمی یاسین آباد کام کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مرکز کورنگی، قرآن مرکز گلستان جوہر اور قرآن مرکز لانڈھی بھی متحرک ہیں۔ ۱۰ ماہ پر محیط قرآن فہمی کورسز، شام کے اوقات میں قرآنی عربی گرامر کلاسز کا انعقاد، رمضان المبارک میں دورہ ترجمہ قرآن کے پروگرامات، مدرسینِ قرآن کے لیے تربیتی کورسز کا انعقاد، بچوں کے لیے ناظرہ اور تجوید کی کلاسز، ہفتہ وار اور ماہنامہ بنیادوں پر دروس قرآن کے حلقہ جات وغیرہ اس انجمن کی نمایاں سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ اس انجمن کی سرگرمیوں کی تفصیل ویب سائیٹ http://www.quranacademy.com/ سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

انجمن خدام القرآن بلوچستان کا قیام کوئٹہ میں ماہ نومبر ۱۹۸۹ء میں عمل میں آیا۔ (سالانہ رپورٹ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور برائے سال ۱۹۹۳ء، مرتب سراج الحق سید، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ص ۳۱) انجمن خدام القرآن پنجاب ملتان کا قیام بھی ۱۹۸۹ء میں ہی عمل میں آیا۔ (ایضاً: ص ۳۳) انجمن خدام القرآن فیصل آباد کی تشکیل ۲۶ مئی ۱۹۹۰ء کو عمل میں آئی۔ (ایضاً: ص ۳۶) انجمن خدام القرآن سرحد پشاور کی بنیاد فروری ۱۹۹۳ء میں رکھی گئی۔ (ایضاً: ص ۳۸) انجمن خدام القرآن جھنگ کی بنیاد ۱۹۹۸ء میں رکھی گئی۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء، مرتب محمود عالم میاں، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ص ۴۹)

انجمن خدام القرآن جھنگ میں ہفتہ وار ترجمہ قرآن کلاسز، تربیتی نشست برائے خواتین، ہفتہ وار اور ماہانہ دروسِ قرآن مجید، ۲۵ روزہ کورسز، پھر سوئے حرم لے چل، وغیرہ اہم سرگرمیاں ہیں۔ (ایضاً: ص ۴۹۔۵۰) علاوہ ازیں جنوری ۲۰۰۷ء سے ایک ماہنامہ مجلّہ 'حکمت بالغہ' کا بھی اجراء کیا گیا۔ (ایضاً: ص ۵۱) انجمن خدام القرآن پنجاب ملتان کے تحت دورہ ترجمہ قرآن، ترجمہ و تفسیر قرآن کلاس، خواتین کی درس قرآن کلاسز اور قرآنیک سمر کیمپس وغیرہ باقاعدگی سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ (ایضاً: ص ۵۴۔۵۵)

انجمن خدام القرآن اسلام آباد کا قیام ۱۹۸۰ء میں عمل میں آیا۔ (ایضاً: ص ۵۷) ۲۰۱۳ء میں راولپنڈی اور اسلام آباد دونوں جگہ ایک سالہ کورس کا آغاز کیا گیا۔ علاوہ ازیں چالیس روزہ فہم دین کورسز بھی کروائے جاتے ہیں۔ (ایضاً: ص ۵۸) انجمن خدام القرآن فیصل آباد کے تحت شعور سکول سسٹم کا بھی آغاز کیا گیا۔ (ایضاً: ص ۶۱)

دعوت رجوع الی القرآن میں مرکزی انجمن کی خدمات

پاکستان میں دعوت رجوع الی القرآن کی علمی توسیع اور تحریکی پھیلاؤ میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا کردار مسلم ہے۔ ذیل میں ہم انجمن کے کارہائے نمایاں میں سے چند ایک کا ذکر کر رہے ہیں:

حلقہ ہائے مطالعہ قرآن

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کے ساتھ ہی لاہور شہر میں معروف مقامات پر حلقہ ہائے مطالعہ قرآن قائم کیے گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

> ''لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کہاں کہاں قائم رہے' اس کا کوئی ریکارڈ نہ تو محفوظ ہے' نہ ہی اس کی چنداں ضرورت ہے۔ یہ حلقے جیسے کہ آغاز میں عرض کیا گیا تھا' کرشن نگر سے شروع ہوئے۔ اور پھر دل محمد روڈ' ساندہ' ڈھولنوال' پنجاب یونیورسٹی اسٹاف کالونی' انجینئرنگ یونیورسٹی کے ہاسٹلز' ایم اے او کالج' میڈیکل کالج ہاسٹل کی مسجد... اور نمعلوم کہاں کہاں قائم رہے۔'' (دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر: ص ۱۷۲)

یہ حلقہ ہائے مطالعہ قرآنی ہفتہ وار' پندرہ روزہ اور ماہوار ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

> ''ان میں سے بعض کے اجتماعات ہفتہ وار ہوتے تھے اور بعض کے پندرہ روزہ' چنانچہ جمعہ اور اتوار کے روز تو اکثر تین تین درس یا خطاب ہو جاتے تھے! پھر ان میں سے اکثر میں تو مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب مکمل بیان ہوا۔ بعض میں اس کی بھی تلخیص ہی بیان ہو پائی۔'' (ایضاً: ص ۱۷۳)

البتہ مسجد خضراء سمن آباد اور مسجد شہداء مال روڈ دو مقامات پر ان دنوں منتخب دروس کے علاوہ مکمل قرآن مجید کے سلسلہ وار دروس کا بھی اہتمام کیا گیا۔ (ایضاً: ص ۱۷۴) جناب محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ان قرآنی حلقوں سے کیسے کیسے جذبے اور ولولے والے داعیانِ قرآن تیار ہو رہے تھے' اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان کے اس واقعے سے ہوتا ہے جو انہوں نے خود نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک روز میں اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں پرواز کی روانگی کے انتظار میں تھا کہ ایک عمدہ لباس میں ملبوس صاحب آ کر میری برابر والی نشست پر بیٹھ گئے' اور مجھ سے سوال کیا: 'آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟' میں نے عرض کیا کہ صورت تو کچھ شناسا سی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر انہوں نے تعارف کروایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں بہت اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور بہت عرصہ قبل میرے مسجد خضراء سمن آباد کے درس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں اپنا بریف کیس کھول کر مجھے منتخب نصاب کے ایک درس کے عربی متن کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دکھائیں اور بتایا کہ میرا معمول ہے کہ جب میں کہیں سرکاری دورے پر

جاتا ہوں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد لوگوں کو جمع کر کے آپ کے مرتب کردہ نصاب کے اسباق کا درس دیتا ہوں۔ اور یہ سلسلہ میں نے کئی سال سے شروع کر رکھا ہے!'' (دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر: ص ۲۲)

اس وقت انجمن خدام القرآن لاہور اور اس کی ذیلی انجمنوں کے تحت ہزاروں حلقہ ہائے قرآنی پورے ملک میں قائم ہیں۔

دارالاشاعت الاسلامیہ کا قیام

دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قائم کردہ پبلشنگ ہاؤس 'دار الاشاعت الاسلامیہ' کا بھی بہت اہم کردار رہا ہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''دعوت رجوع الی القرآن اور تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن کے دورِ اوّل کا تیسرا اہم سنگِ میل 'دار الاشاعت الاسلامیہ لاہور' اور اس کا سلسلہ مطبوعات ہے۔ میرا یہ خالص نجی اشاعتی ادارہ اوائل ۱۹۶۶ء ہی میں قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ 'تحریک جماعت اسلامی' کا پہلا ایڈیشن بھی اسی کے زیر اہتمام اپریل ۶۶ء میں شائع ہوا۔ اور ماہنامہ 'میثاق' کا میرے زیر ادارت اجراء بھی اگست ۶۶ء میں اسی کے تحت ہوا۔'' (ایضاً: ص ۱۷۹)

اس ادارے نے اُس وقت مولانا اصلاحیؒ کی کتابیں شائع کیں جبکہ لوگ مولانا کو بھول چکے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''صورت واقعی یہ تھی کہ مولانا کو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے دس سال بیت چکے تھے اور چونکہ اس عرصے میں کوئی ادارہ یا نئی ہیئتِ تنظیمی قائم نہیں ہو سکی تھی لہٰذا ان کی تصانیف بالفعل 'نسیاً منسیاً' کی مصداق بن چکی تھیں۔ اور جب دار الاشاعت الاسلامیہ نے ان کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا نے فرطِ جذبات میں یہ الفاظ فرمائے تھے: 'میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے دوبارہ زندہ کر دیا ہے'۔'' (ایضاً: ص ۱۸۱)

اور مولانا اصلاحیؒ کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کی پہلی جلد جن حالات میں اس مکتبہ نے شائع کی' اس کے بارے ڈاکٹر اسرار احمدؒ لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہوا تھا کہ مولانا نے اپنی ضروریات کے لیے وقتاً فوقتاً حکیم [عبدالرحیم اشرف] صاحب سے کچھ رقوم قرض لی تھیں' جن کی واپسی کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو رہی تھی' ایک بار حکیم صاحب ملاقات کے لیے آئے تو مولانا نے تفسیر کی جلد اوّل کا تصحیح شدہ مسودہ ان کے سامنے رکھ دیا' گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کہ ع 'یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر۔ اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!' چنانچہ حکیم صاحب اسے لے تو گئے لیکن ان کی 'وہابیت' اس کی اشاعت میں حائل رہی' اور وقت اسی طرح گزرتا جا رہا تھا کہ میری لاہور منتقلی ہو گئی اور میں نے حکیم صاحب کی رقم ان کو ادا کر کے مسودہ حاصل کر لیا!'' (ایضاً: ص ۱۸۱)

رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن

۱۹۸۴ء بمطابق ۱۴۰۴ھ میں قرآن اکیڈمی لاہور میں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں تراویح کی

نماز کے ساتھ قرآن حکیم کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک منفرد سلسلہ شروع ہوا کہ جس میں ہر روز تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے سیپارے کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی تھی۔ اس عمل کو لوگوں میں خوب پذیرائی ملی اور اِس وقت مرکزی انجمن اور اس کی ذیلی انجمنوں کی نگرانی میں پاکستان بھر میں سینکڑوں مقامات پر تراویح کے ساتھ قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۱۱۔۲۰۱۲ء، مرتب محمود عالم میاں، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ص ۵۶) دورۂ ترجمہ قرآن میں اوسطاً ساڑھے تین گھنٹے روزانہ کا 'بیان القرآن' اور لگ بھگ دو گھنٹے کی نماز تراویح ہوتی تھیں۔ ۱۹۸۸ء میں اس دورہ کی پہلی آڈیو ریکاڈنگ ہوئی۔ (دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر: ص ۲۴۰) سال ۲۰۱۲ء میں قرآن اکیڈمی میں دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکاء کی تعداد ۴۰۰ سے ۵۰۰ تک تھی جن میں ایک صد کے قریب خواتین تھیں۔ (سالانہ رپورٹ ۲۰۱۲۔ ۲۰۱۳ء، ص ۱۰) اس وقت بلاشبہ کراچی سے سرحد تک سینکڑوں مساجد، شادی ہالز اور گھروں میں رمضان المبارک کے بابرکت مہینے میں تراویح کے ساتھ قرآن مجید کے ترجمہ یا خلاصہ مضامین کے بیان کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

سالانہ قرآن کانفرنسیں اور قرآنی محاضرات

۱۹۷۳ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت سالانہ کانفرنسوں کا آغاز ہوا (دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر: ص ۲۱۵) جو تا حال جاری ہیں۔ ان کانفرنسوں اور محاضرات میں شامل ہونے والے اہلِ علم حضرات میں مولانا سید یوسف بنوری، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد چراغ، مولانا عبید اللہ انور، مولانا سید حامد میاں، مولانا سید منتخب الحق قادری، مولانا محمد مالک کاندھلوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر منظور احسن عباسی، پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور مولانا سید ابوبکر غزنوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ شامل ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۱۶)

ان محاضرات میں مستقل تعاون کرنے والوں میں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا محمد طاسین، مولانا اخلاق حسین قاسمی، علامہ سید غلام شبیر بخاری، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، مولانا سعید الرحمٰن علوی، پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی، پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ نذر احمد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد اسحاق بھٹی، مولانا عبدالرحمٰن مدنی، پروفیسر محمد اسلم، ڈاکٹر امان اللہ ملک اور ڈاکٹر خالد علوی شامل ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۱۶۔۲۱۷)

قرآنی تربیت گاہیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کے کل چار ماہ بعد ہی پہلی قرآنی تربیت گاہ کا انعقاد عمل میں آ گیا... بعد میں ہر سال یہ تربیت گاہیں ہوتی رہی ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۲۲) پہلی دس روزہ تربیت گاہ ۱۳ سے ۲۲ اگست مسجد خضراء سمن آباد میں منعقد ہوئی۔ مستقلاً شرکاء کی تعداد چالیس سے پچاس تک تھی، جبکہ جزوی شرکت میں یہ تعداد پانچ صد سے تجاوز کر جاتی تھی۔ (دس سالہ رپورٹ مرکزی انجمن خدام القرآن: ص ۲۴۔۲۵) اس تربیت گاہ میں قیام اللیل کا بھی اجتماعی اہتمام کیا گیا، جس میں آٹھ راتوں میں قاری عبدالقادر صاحب نے پورا قرآن کریم ختم کرایا۔ (دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر: ص ۲۲۶)

قرآن کالج

۱۹۸۴ء میں قرآن کالج کے لیے اتاترک بلاک گارڈن ٹاؤن میں ایک قطعہ زمین خریدا گیا اور ۱۹۸۹ء میں اس عمارت میں باقاعدہ کلاسز کا آغاز ہوا۔ (عوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر: ص ۲۳۲)

۱۹۹۰ء میں ایف اے سال اوّل کے لیے داخلے کیے گئے۔ شروع میں داخلہ لینے والے طلبہ کو ایک اضافی سال میں عربی اور جامع دینی نصاب کی تعلیم بھی ساتھ ہی دی جاتی تھی۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۱۹۹۰ء، مرتب سراج الحق سید، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ص ۸۔۹)

قرآن کالج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ایف اے، ایف ایس سی پاس طلبہ کو تین سال میں ایک جانب بی اے کے امتحان کی مناسب تیاری کروادی جائے اور دوسری طرف عربی صرف ونحو کی بنیاد کو پختہ کر کے پورے قرآن مجید کا ترجمہ مع مختصر تفسیر، مطالعہ قرآن مجید کا وہ منتخب نصاب تفصیلی تدریس کے انداز میں جو انجمن خدام القرآن کی تحریک کی اساس بنا ہے، اور حدیث نبوی کا مختصر انتخاب پڑھا دیا جائے تو تحریک رجوع الی القرآن کے مقاصد نہایت عمدگی اور سرعت سے حاصل ہوں گے۔ (قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ص ۹)

اپریل ۲۰۰۸ء میں اس کالج کو بوجوہ بند کر دیا گیا (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۰۷۔۲۰۰۸ء، مرتب محمود عالم میاں، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ص ۳۲۔۳۳) اور کالج کی عمارت میں 'کلیۃ القرآن' کا آغاز کیا گیا۔ اس دوران سینکڑوں طلبہ نے قرآن کالج سے گریجویشن مکمل کی اور وہ معاشرے میں مختلف عہدوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے قرآنی فکر کو عام کر رہے ہیں۔

کلیۃ القرآن

قرآن کالج کی سرگرمیوں کو بند کر کے 'کلیۃ القرآن' کھولنے کے مقصد کو انجمن کی سالانہ رپورٹ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''۲۸ ستمبر ۲۰۰۷ء کو مرکزی انجمن کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے یہ فیصلہ کیا کہ قرآن کالج میں جاری تعلیمی سرگرمیوں کو مختلف وجوہات کی بنا پر بند کر دیا جائے..... اس فیصلے کے بعد مرکزی انجمن کی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۷ء، ۲۷ جنوری ۲۰۰۸ء اور ۲۷ اپریل ۲۰۰۸ء میں قرآن کالج کی عمارت سے بہتر استفادے کی تجاویز پر غور و فکر کیا گیا۔ اس ضمن میں متعدد تجاویز زیر غور آئیں، جن میں سے مندرجہ ذیل دو تجاویز کو حتمی طور منظور کر لیا گیا۔ ۱۔ میٹرک یا ایف اے کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے اور ان کو چھ یا آٹھ سال میں درس نظامی کے ساتھ میٹرک، ایف اے/بی اے اور ایم اے کروایا جائے۔ ۲۔ گریجوایٹس کو داخلہ دیا جائے اور انہیں چار سال میں درس نظامی کی طرز کا دینی کورس پڑھایا جائے اور ساتھ ہی ایم اے کی تیاری بھی کرائی جائے... متذکرہ بالا دو تعلیمی منصوبوں میں سے مقدم الذکر منصوبے پر عملی پیش رفت فوری طور پر کی گئی اور جولائی ۲۰۰۸ء میں بیان کردہ خطوط پر کلیۃ القرآن کے ایک نئے منصوبے کا آغاز کیا گیا، جس میں پختہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا

ہے۔ دینی تعلیم کے ضمن میں ان شاء اللہ مکمل درس نظامی (آٹھ سالہ کورس) مع تخصص فی علوم القرآن کروایا جائے گا اور اس کے ساتھ میٹرک' ایف اے اور بی اے کی تعلیم دی جائے گی۔ مزید برآں ایم اے عربی/اسلامیات کے امتحان کی تیاری میں مکمل رہنمائی دی جائے گی۔ ان شاء اللہ!'' (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۰۸۔۲۰۰۹ء' مرتب محمود عالم میاں' مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور' ص ۱۸۔۱۹)

۱۲۰۲۔۲۰۱۳ء کی رپورٹ کے مطابق کلیۃ القرآن کے طلبہ کی مجموعی تعداد ۱۰۵ ہے اور درس نظامی میں درجہ اولیٰ سے درجہ سادسہ جبکہ اسکول میں میٹرک سے بی اے تک کلاسز جاری ہیں۔ کلیۃ القرآن کا الحاق درجہ سادسہ تک وفاق المدارس العربیۃ سے ۲۰۱۶ء تک کے لیے ہے۔ درسِ نظامی کا نصاب بھی وہی مقرر کیا گیا ہے جو وفاق المدارس العربیۃ کا ہے۔ اسی رپورٹ کے مطابق امسال ثانویہ عامہ کا رزلٹ ۸۳ فی صد جبکہ ثانویہ خاصہ کا ۹۲ فی صد رہا۔ اسی طرح میٹرک کا رزلٹ ۸۰ فی صد اور ایف اے کا ۶۶ فی صد رہا ہے۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء' ص ۲۷۔۲۹)

قرآن اکیڈمی

قرآن اکیڈمی کا تصور ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنے کتابچے 'اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام' میں پیش کیا اور اسی کے مطابق اس کا سنگ بنیاد ۱۰ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ بمطابق ۱۳ جنوری ۱۹۷۶ء کو رکھا گیا۔ اس موقع پر دیگر حضرات کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ بھی موجود تھے جنہوں نے ان مقاصد میں کامیابی کی دعا فرمائی جن کے لیے اکیڈمی کا قیام عمل میں آ رہا تھا۔ (دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر: ص ۲۲۷)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنی کتاب میں 'کرنے کا اصل کام' کے عنوان سے قرآن اکیڈمی کے قیام کے مقصد کو یوں بیان کرتے ہیں:

''دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں' تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی' ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا' دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہوگا۔ نتیجتاً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اکیڈمی کا اصل کام ہوگا' اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے' یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے' اور ساتھ ہی حدیث

نبوی ﷺ فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ والٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے‘ ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید کریں اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔‘‘

(اسرار احمد‘ ڈاکٹر‘ اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘ مرکزی انجمن خدام القرآن‘ لاہور‘ ص ۲۶۔۲۷)

قرآن اکیڈمی کا اکیڈمک ونگ چار شعبوں پر مشتمل ہے: شعبہ مطبوعات‘ شعبہ تحقیق اسلامی‘ شعبہ تدریس اور شعبہ انگریزی (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۰۵۔۲۰۰۶ء‘ مرتب خالد محمود خضر‘ مرکزی انجمن خدام القرآن‘ لاہور‘ ص ۹) شعبہ مطبوعات کے تحت تین ذیلی سیکشن کام کرتے ہیں: ۱۔ تصنیف و تالیف اور ترتیب و تسوید سیکشن۔ ۲۔ کمپوزنگ سیکشن۔ ۳۔ پرنٹنگ سیکشن (ایضاً: ص ۱۰) تین مجلّات ماہنامہ میثاق‘ سہ ماہی حکمت قرآن اور ہفت روزہ ندائے خلافت کی اشاعت بھی اسی شعبہ کے تحت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انجمن کی جملہ کتب کی اشاعت کی ذمہ داری بھی اسی شعبہ کی ہے۔ شعبہ مطبوعات کے تحت تقریباً ایک صد کتب بھی شائع کی گئیں ہیں۔ اکثر کتب ایسی ہیں کہ جن کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۲۰۰۴ء میں شعبہ تحقیق اسلامی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۰۴۔۲۰۰۵‘ مرکزی انجمن خدام القرآن‘ لاہور‘ ص ۱۷) مجلّات یعنی حکمت قرآن‘ میثاق اور ندائے خلافت کے لیے علمی‘ تحریکی‘ دعوتی اور تحقیقی مضامین کی تیاری‘ ان کا انتخاب اور جانچ پڑتال کا کام شعبہ تحقیق کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔ علاوہ ازیں معاشی‘ معاشرتی‘ سیاسی‘ دعوتی اور تحریکی زندگی سے متعلق شرعی رہنمائی کا کام بھی شعبہ تحقیق سے وابستہ اہل علم کے ذمہ ہوتا ہے۔ قرآن اکیڈمی کی لائبریری کا انتظام‘ جو کہ تقریباً ۱۲ ہزار کتب پر مشتمل ہے‘ بھی شعبہ تحقیق کے تحت داخل ہے۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء‘ ص ۱۹)

شعبہ تدریس کے تحت ایک سالہ اور دو سالہ رجوع الی القرآن کورسز کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء کے سیشن میں ۳۳ مرد اور ۲۳ خواتین نے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس مکمل کیا جبکہ اسی سیشن میں دو سالہ رجوع الی القرآن مکمل کرنے والے طلبہ کی تعداد ۱۲ تھی۔ (ایضاً: ص ۲۰) اس کورس کو جاری ہوئے بھی ربع صدی ہونے کو ہے اور ان کورسز سے بلاشبہ سینکڑوں ایسے داعیانِ قرآن پیدا ہوئے جو تعلیم و تعلّمِ قرآن مجید کے لیے اپنی زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں۔ اس شعبہ کے تحت شام کے اوقات میں بھی فہم دین کورسز سارا سال جاری رہتے ہیں۔ شعبہ انگریزی کے تحت انجمن خدام القرآن کے قرآنی لٹریچر کو انگریزی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔

قرآن اکیڈمی لاہور کی طرز پر کراچی‘ جھنگ‘ ملتان‘ فیصل آباد‘ راولپنڈی اور پشاور میں بھی قرآن اکیڈمیاں قائم کی گئیں جو قرآن مجید کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّم کا فریضہ بحسن و خوبی سرانجام دے رہی ہیں۔

تحریکی و تحقیقی مجلّات کی اشاعت

ماہنامہ ’میثاق‘ کا پہلی بار اجراء مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ادارت میں جون ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ بعد ازاں

اس کی اشاعت میں مولانا کی طرف سے تعطل آ گیا تو انہوں نے یہ مجلّہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو دے دیا۔ ۱۹۶۶ء سے یہ مجلّہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۷۳ء میں اس مجلّہ نے مرکزی انجمن خدام القرآن کے ایک آرگن کی حیثیت اختیار کر لی۔ مئی ۱۹۸۲ء میں یہ مجلّہ تنظیم اسلامی کی تحویل میں دے دیا گیا اور ماہنامہ 'حکمت قرآن' انجمن کے زیر اہتمام شائع ہوا اور انجمن کا ترجمان قرار پایا۔

ماہنامہ 'حکمت قرآن' ڈاکٹر رفیع الدینؒ کی ادارت میں شائع ہونے والا ایک مجلّہ تھا' جو اُن کے انتقال کے بعد بند ہو گیا تھا۔ بعد ازاں اس مجلّہ کی اشاعتی کمیٹی 'آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس' نے یہ مجلّہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حوالے کر دیا اور مئی ۱۹۸۳ء سے یہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے ایک آرگن کی حیثیت سے شائع ہونا شروع ہو گیا۔ (دس سالہ رپورٹ' ص ۴۳۔۴۷) مرکزی انجمن خدام القرآن کی مجلس شوریٰ کے ایک فیصلے کے مطابق جنوری ۲۰۰۸ء سے اس مجلّہ کو سہ ماہی بنا دیا گیا۔

ہفت روزہ 'ندا' کا آغاز ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بھائی اقتدار احمدؒ نے مارچ ۱۹۸۸ء میں کیا۔ جنوری ۱۹۹۱ء سے یہ ہفت روزہ 'ندائے خلافت' کے نام سے تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے شعبہ مطبوعات کے تحت شائع ہو رہا ہے۔ (عارف رشید' ڈاکٹر' ۲۵ سالہ رپورٹ' ماہنامہ حکمت قرآن' نومبر ۱۹۹۷ء' جلد ۱۶' شمارہ ۱۱' ص ۸۱)

خط و کتابت کورسز

شعبہ خط و کتابت کورسز کا آغاز جنوری ۱۹۸۸ء میں کیا گیا۔ اس کے تحت جاری ہونے والے اوّلین کورس کا نام 'قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس' ہے۔ ۱۹۹۰ء میں عربی گرامر کا کورس بھی شروع کیا گیا اور ۱۹۹۶ء میں ترجمہ قرآن مجید کورس کا آغاز کیا گیا۔ (ایضاً: ص ۳۰) اس کورس کا مقصد گھر بیٹھے قرآن فہمی یا عربی سیکھنے کی سہولت میسر کرنا تھا۔ اس شعبہ کے تحت نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک بھی قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس' عربی گرامر کورس اور ترجمہ قرآن مجید کورس کروائے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس میں ۴۳۲۱ طلبہ نے داخلہ لیا جبکہ تقریباً ۶۰۰ نے اسے مکمل کیا۔ عربی گرامر کورس میں ۳۷۹۹ طلبہ نے داخلہ لیا اور اب تک تقریباً ۶۰۰ مکمل کر چکے ہیں۔ ترجمہ قرآن کورس میں حصہ لینے والوں کی تعداد ۲۸۷۹ ہے' جبکہ مکمل کرنے والے ۳۰۲ طالب علم ہیں۔ (سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۱۲۔۲۰۱۳ء' ص ۳۴۔۳۵) یہ کورسز اب آن لائن بھی جلد ہی شروع کیے جا رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے ایک ویب سائیٹ ڈیزائن کی جا رہی ہے۔

شعبہ سمع و بصر

شعبہ سمع و بصر مرکزی انجمن خدام القرآن کا ایک اہم شعبہ ہے جو کئی ایک ذمہ داریاں سرانجام دیتا ہے' جن میں اہم تر قرآن کی دعوتی فکر اور لٹریچر کی آڈیوز اور ویڈیوز کی تیاری ہے۔ ذیل میں ہم ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۵ء کے دوران اس شعبہ کے تحت تیار ہونے والی قرآنی فکر پر مشتمل آڈیوز اور ویڈیوز کی تعداد نقل کر رہے ہیں جس سے یہ احساس بخوبی پیدا ہوتا ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن کو عام کرنے میں اس ذریعہ سے مرکزی انجمن خدام

القرآن نے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے۔

	۲۰۰۱ـ۲۰۰۲ء	۲۰۰۲ـ۲۰۰۳ء	۲۰۰۳ـ۲۰۰۴ء	۲۰۰۴ـ۲۰۰۵ء	۲۰۰۵ـ۲۰۰۶ء
آڈیو کیسٹس	۲۱,۶۰۵	۲۰,۵۰۰	۲۴,۰۴۶	۳۶,۱۴۶	۱۷,۷۷۱
ویڈیو کیسٹس	۳,۴۵۰	۱,۴۵۰	۲,۶۰۵	۲,۲۳۳	۴۰۳
سی ڈیز	۱۰,۸۲۲	۲۸,۴۷۶	۷۵,۰۲۶	۱۶۰,۹۲۸	۱۵۲,۲۹۷
ڈی وی ڈیز	—	—	—	۱۹,۹۹۰	۳۹,۵۶۷

(سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۰۵ـ۲۰۰۶ء مرتب خالد محمود خضر، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، ص ۲۳)

قرآن حکیم کی دعوتی فکر کو عام کرنے کے مختلف ٹی وی چینلز کو پروگرام تیار کر کے فراہم کرنا بھی اسی شعبہ کی ذمہ داری ہے۔ لاہور کی سطح پر K چینل کے نام سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ ڈاکٹر ذاکر نائیک اور احمد دیداتؒ کی تقاریر نشر کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اسی طرح Q tv اور Peace tv اور یورپ میں Prime tv پر ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی نشر ہونے والی جملہ ریکارڈنگز بھی شعبہ سمع و بصر ہی فراہم کر رہا ہے۔ (ایضاً: ص ۲۷)

تنظیم اسلامی کی ویب سائیٹ www.tanzeem.org کا انتظام و انصرام بھی اسی شعبہ کے پاس ہے۔ یہ اگرچہ تنظیم اسلامی کی ویب سائیٹ ہے، جو خلافت کے قیام کی اجتماعی جدوجہد کے لیے قائم کی جانے والی ایک اسلامی تحریک ہے اور اس کے بانی بھی ڈاکٹر اسرار احمدؒ ہیں، لیکن اس پر مرکزی انجمن خدام القرآن کی شائع شدہ جملہ کتب اور نشر کردہ آڈیو اور ویڈیو لیکچرز موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً اپ لوڈ اور اپ ڈیٹ بھی کیے جاتے ہیں۔ البتہ اس بات کی کمی محسوس ہوتی ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن جیسے بڑے ادارے کی کوئی علیحدہ سے ویب سائیٹ موجود نہیں ہے جہاں اس کی تاریخ، دستور، اراکین کا تعارف، سالانہ رپورٹس، جملہ لٹریچر اور سرگرمیوں کا بھرپور تعارف موجود ہو۔

مقالہ نگار: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، ہیومینیٹیز ڈیپارٹمنٹ، کامسٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
Email: mzubair@ciitlahore.edu.pk

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت، اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ المائدۃ

آیات ۹۷ تا ۱۰۰

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ
لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ ؕ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا
تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

ترکیب: ''جَعَلَ'' کے دو مفعول آتے ہیں' کس کو بنایا اور کیا بنایا۔ یہاں ''جَعَلَ'' کا مفعول اوّل ''اَلْكَعْبَةَ'' ہے۔لیکن ''اَلْبَيْتَ الْحَرَامَ'' مفعول ثانی نہیں ہے' بلکہ یہ ''اَلْكَعْبَةَ'' کا بدل ہے اور مفعول ثانی ''قِيٰمًا'' ہے۔ ''اَلشَّهْرَ الْحَرَامَ، اَلْهَدْيَ'' اور ''اَلْقَلَائِدَ'' یہ سب بھی ''جَعَلَ'' کے مفعول اوّل ہیں اور ان پر لامِ جنس ہے' جبکہ ان کا مفعول ثانی بھی ''قِيٰمًا'' ہے۔ ''يَسْتَوِيْ'' کا فاعل ہونے کی وجہ سے ''اَلْخَبِيْثُ'' اور ''اَلطَّيِّبُ'' حالت رفع میں آئے ہیں اور ''اَعْجَبَ'' کا فاعل ''كَثْرَةُ'' ہے۔

ترجمہ:

جَعَلَ : بنایا — اللّٰهُ : اللہ نے
اَلْكَعْبَةَ : کعبہ کو — اَلْبَيْتَ الْحَرَامَ : جو یہ محترم گھر ہے
قِيٰمًا: کھڑے ہونے کا ذریعہ (معیشت میں) — لِّلنَّاسِ : لوگوں کے لیے
وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ : اور محترم مہینوں کو (بھی) — وَالْهَدْيَ: اور قربانی کے جانوروں کو (بھی)

وَالْقَلَآئِدَ :اور پٹوں (والوں) کو (بھی)
لِتَعْلَمُوْٓا :اس لیے کہ تم لوگ جان لو
اللّٰهَ :اللہ
مَا :اس کو جو
وَمَا :اور اس کو جو
وَاَنَّ :اور یہ کہ
بِكُلِّ شَیْءٍ :ہر چیز کو
اِعْلَمُوْٓا :تم لوگ جان لو
اللّٰهَ :اللہ
وَاَنَّ :اور یہ کہ
غَفُوْرٌ :بے انتہا بخشنے والا ہے
مَا :نہیں ہے
اِلَّا :مگر
وَاللّٰهُ :اور اللہ
مَا :اس کو جو
وَمَا :اور اس کو جو
قُلْ :آپؐ کہہ دیجیے
الْخَبِیْثُ :ناپاک
وَلَوْ :اور اگرچہ
كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ :ناپاک کی کثرت
اللّٰهَ :اللہ کا
لَعَلَّكُمْ :شاید کہ تم لوگ

ذٰلِكَ :یہ
اَنَّ :کہ
یَعْلَمُ :جانتا ہے
فِی السَّمٰوٰتِ :آسمانوں میں ہے
فِی الْاَرْضِ :زمین میں ہے
اللّٰهَ :اللہ
عَلِیْمٌ :جاننے والا ہے
اَنَّ :کہ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ :گرفت کا سخت ہے
اللّٰهَ :اللہ
رَّحِیْمٌ :ہر حال میں رحم کرنے والا ہے
عَلَی الرَّسُوْلِ :ان رسولؐ پر
الْبَلٰغُ :پہنچانا
یَعْلَمُ :جانتا ہے
تُبْدُوْنَ :تم ظاہر کرتے ہو
تَكْتُمُوْنَ :تم چھپاتے ہو
لَا یَسْتَوِی :برابر نہیں ہوتیں
وَالطَّیِّبُ :اور پاکیزہ (چیزیں)
اَعْجَبَكَ :بھلی لگے تجھ کو
فَاتَّقُوا :تو تقویٰ (اختیار) کرو
یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ :اے ہوشمندو
تُفْلِحُوْنَ :فلاح پاؤ

نوٹ: کسی اصول یا چیز کے معقول اور پسندیدہ ہونے کی دلیل کے طور پر اکثر سننے میں آتا ہے کہ ''یہ تو ساری دنیا مانتی ہے'' یا ''یہ بات تو بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے''۔ زیر مطالعہ آیت ۱۰۰ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ آپؐ اعلان کر دیجیے کہ کسی چیز کا رواج پا جانا اس کے معقول اور پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ایک غلط معیار ہے جو انسانوں نے اختیار کر لیا ہے۔

جو انسان تھوڑی سی بھی سوجھ بوجھ رکھتا ہے اسے سوچنا چاہیے کہ ہندوستان کے سارے ہندو گائے کے پیشاب کو کتنا بھی پوتّر یعنی پاکیزہ قرار دے لیں، پھر بھی اس کے پیشاب کی نجاست میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اسے

سوچنا چاہیے کہ اگر گائے کا پیشاب واقعی اتنا ہی پاکیزہ ہے تو پھر اس کے گوبر سے پرہیز کیوں؟ جس طرح وہ گائے کے پیشاب کو اپنے سر اور چہرے پر ملتے ہیں اسی طرح اس کا گوبر بھی مل لیا کریں۔ بالکل اسی طرح سے جوا' شراب' سود اور اس قبیل کی باقی چیزیں خواہ کتنا ہی رواج پا جائیں' پھر بھی ان کی خباثت اپنی جگہ برقرار رہے گی۔

آیات ۱۰۱ تا ۱۰۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

س ی ب

سَابَ يَسِيْبُ (ض) سَيْبًا : پانی کا اِدھر اُدھر بہنا' مویشی کا آزاد پھرنا۔

سَائِبَةٌ (اسم الفاعل) : آزاد پھرنے والی۔ اصطلاحاً ایسی اونٹنی کو کہتے ہیں جسے مقدس قرار دے کر آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ آیت زیر مطالعہ۔

ح م ی

حَمٰى يَحْمِيْ (ض) حَمْيًا : کسی چیز کو کسی سے روکنا' بچانا' حمایت کرنا۔

حَامٍ (اسم الفاعل) : بچانے والا۔ اصطلاحاً ایسے اونٹ کو کہتے ہیں جسے مقدس قرار دے کر آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ آیت زیر مطالعہ۔

حَمِيَ يَحْمٰى (س) حُمِيًّا : کسی چیز کا بہت تیز گرم ہو جانا۔

حَامِيَةً (اسم الفاعل) : گرم ہونے والی۔ ﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿۴﴾﴾ (الغاشية) ''وہ گریں گے ایک جلنے والی (یعنی دہکتی ہوئی) آگ میں۔''

حَمِيَّةٌ (اسم ذات) : جذبات کی گرمی کا ابال' جوش' نخوت۔ ﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ﴾ (الفتح:۲۶) ''اور جب رکھی انہوں نے جنہوں نے کفر کیا' اپنے دلوں میں نخوت۔''

اَحْمٰى (افعال) اِحْمَاءً : کسی چیز کو خوب گرم کرنا' تپانا۔ ﴿يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ﴾ (التوبة:۳۵) ''جس دن تپایا جائے گا اس کو جہنم کی آگ میں۔''

ترکیب : ''شَیْءٌ'' کی جمع ''اَشْیَاءُ'' غیر منصرف آتی ہے۔ یہاں ''اَشْیَاءَ'' حالتِ جر میں ہے اور نکرہ موصوفہ

ہے۔آگے جملہ شرطیہ ''اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ'' اس کی صفت ہے۔''تُبْدَ'' دراصل باب افعال کے مضارع مجہول میں مؤنث کا صیغہ ''تُبْدٰی'' ہے اور ''اِنْ'' کی وجہ سے اس کی ''ی'' گری ہوئی ہے جبکہ ''تَسُؤْ'' جوابِ شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم آیا ہے۔''سَائِبَةٍ ، وَصِیْلَةٍ'' اور ''حَامٍ'' یہ سب ''مِنْ'' بَحِیْرَةٍ'' کی ''مِنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہوئے ہیں اور یہ ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔''لَا یَضُرُّ'' کا فاعل ''مَنْ'' ہے۔

ترجمہ:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ :اے لوگو! جو
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
لَا تَسْئَلُوْا :تم مت پوچھو
عَنْ اَشْیَآءَ :ایسی چیزوں کے بارے میں
اِنْ :کہ اگر
تُبْدَ:وہ ظاہر کردی جائیں
لَکُمْ :تمہارے لیے
تَسُؤْکُمْ :تو وہ بری لگے تم کو
وَاِنْ :اور اگر
تَسْئَلُوْا :تم پوچھو گے
عَنْهَا :ان کے بارے میں
حِیْنَ :اس وقت کہ
یُنَزَّلُ :اتارا جاتا ہے
الْقُرْاٰنُ :قرآن
تُبْدَ :تو وہ ظاہر کردی جائیں گی
لَکُمْ :تمہارے لیے
عَفَا :درگزر کیا
اللّٰهُ :اللہ نے
عَنْهَا :اس سے
وَاللّٰهُ :اور اللہ
غَفُوْرٌ :بے انتہا بخشنے والا ہے
حَلِیْمٌ :بردبار ہے
قَدْ سَاَلَهَا :پوچھ چکی ہے ان کو
قَوْمٌ :ایک قوم
مِّنْ قَبْلِکُمْ :تم سے پہلے
ثُمَّ :پھر
اَصْبَحُوْا :وہ ہو گئے
بِهَا :اس کا
کٰفِرِیْنَ :انکار کرنے والے
مَا جَعَلَ :نہیں بنایا
اللّٰهُ :اللہ نے
مِنْ بَحِیْرَةٍ :کسی قسم کا کوئی بحیرہ
وَّلَا سَآئِبَةٍ :اور نہ کسی قسم کا کوئی سائبہ
وَّلَا وَصِیْلَةٍ :اور نہ کسی قسم کا کوئی وصیلہ
وَّلَا حَامٍ :اور نہ ہی کوئی حامی
وَّلٰکِنَّ :اور لیکن (یعنی بلکہ)
الَّذِیْنَ :جنہوں نے
کَفَرُوْا :انکار کیا
یَفْتَرُوْنَ :وہ گھڑتے ہیں
عَلَی اللّٰهِ :اللہ پر
الْکَذِبَ :جھوٹ
وَاَکْثَرُهُمْ :اور ان کے اکثر
لَا یَعْقِلُوْنَ :عقل سے کام نہیں لیتے
وَاِذَا :اور جب بھی
قِیْلَ :کہا جاتا ہے
لَهُمْ :ان سے
تَعَالَوْا :کہ تم آؤ
اِلٰی مَآ :اس کی طرف جو

اَنْزَلَ :اتارا
وَاِلَی الرَّسُوْلِ :اوران رسولؐ کی طرف
حَسْبُنَا :کافی ہے ہم کو
وَجَدْنَا :ہم نے پایا
اٰبَآءَ نَا :اپنے آباءواجداد کو
لَوْ :اگر
اٰبَآؤُھُمْ :ان کے آباءواجداد
شَیْئًا :کچھ بھی
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ :اے لوگو! جو
عَلَیْکُمْ :تم پر (ذمہ داری) ہے
لَا یَضُرُّکُمْ :نقصان نہیں دے گا تم کو
ضَلَّ :گمراہ ہوا
اھْتَدَیْتُمْ :تم ہدایت پر ہو
مَرْجِعُکُمْ :تم کو لوٹنا ہے
فَیُنَبِّئُکُمْ :پھر وہ آگاہ کردے گا تم کو
کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ :تم عمل کیا کرتے تھے

اللّٰہُ :اللہ نے
قَالُوْا :تو وہ کہتے ہیں
مَا :وہ
عَلَیْہِ :جس پر
اَوَ :تو کیا
کَانَ :تھے
لَا یَعْلَمُوْنَ :کہ نہیں جانتے تھے
وَّلَا یَھْتَدُوْنَ :اور نہ ہدایت پاتے تھے
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
اَنْفُسَکُمْ :اپنے نفوس کی
مَّنْ :وہ، جو
اِذَا :جبکہ
اِلَی اللّٰہِ :اللہ کی طرف ہی
جَمِیْعًا :سب کو
بِمَا :اس سے جو

نوٹ ۱: نبی اکرم ﷺ خود بھی لوگوں کو کثرتِ سوال سے اور خواہ مخواہ ہر بات کی کھوج لگانے سے منع فرماتے رہتے تھے۔ ایسی ہی ایک حدیث میں ہے: ''اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں، انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے، ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی ہو، لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ''۔ اب جو شخص مجمل کو مفصل اور غیر معیّن کو معیّن کرتا ہے، وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

سلسلۂ وحی منقطع ہونے کے بعد بھی سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں پڑنا یا بے ضرورت چیزوں کے متعلق سوالات کرنا مذموم ہی رہے گا، کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''مسلمان ہونے کی ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان جو فضول چیزوں کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا کیا نام تھا اور نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول وعرض کیا تھا، جن کا کوئی اثر انسان کے عمل پر نہیں پڑتا، ایسے سوالات کرنا مذموم ہے، جبکہ ایسے سوالات کرنے والے اکثر حضرات دین کے ضروری اور اہم مسائل سے بے خبر ہوتے ہیں۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲: آغازِ اسلام سے قبل یہ رواج عام تھا کہ مختلف طریقوں سے مویشیوں کو مقدس قرار دے کر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا اور نہ اس کا اُون اتارا جاتا۔ اسے

حق ہوتا کہ جس کھیت اور چراگاہ میں چاہے چرے اور جس گھاٹ سے چاہے پانی پیے۔ ایسے مویشیوں کے مختلف نام تھے۔ تقدس کی علامت کے طور پر جس اونٹنی کے کان چیر کر آزاد کرتے اسے ''بحیرہ'' کہتے۔ کوئی منت پوری ہونے پر شکرانے کے طور پر جس اونٹ یا اونٹنی کو آزاد کرتے اسے ''سائبہ'' کہتے۔ کوئی بکری اگر پہلی بار ایک نر اور ایک مادہ' جڑواں بچے دیتی تو نر بچے کو آزاد چھوڑ دیتے' اسے ''وصیلہ'' کہتے۔ جس اونٹ کا پوتا سواری دینے کے قابل ہو جاتا' اسے بھی آزاد چھوڑ دیتے' اسے ''حام'' کہتے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۳: زیر مطالعہ آیت ۱۰۴ میں دوسروں کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک مؤثر طریقہ بتلایا گیا ہے جس سے مخاطب کی دل آزاری نہ ہو۔ یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل اور گمراہ تھے' بلکہ ایک سوال پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ کیا باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی معقول بات ہوگی جبکہ باپ دادا نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل؟ پھر اگلی آیت میں دوسروں کی اصلاح کی فکر کرنے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جب تم نے حق کی تبلیغ اور تعلیم کی مقدور بھر کوشش کر لی اور اس کے بعد بھی کوئی گمراہی پر جما رہے' تو تم اس کی فکر میں نہ پڑو۔ اس حالت میں دوسروں کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۰۶ تا ۱۰۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ح ب س

حَبَسَ يَحْبِسُ (ض) حَبْسًا : کسی کو اٹھنے یا نکلنے سے روکے رکھنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ع ث ر

عَثَرَ يَعْثُرُ (ن) عِثَارًا : پھسل جانا' بلا ارادہ کسی بات پر مطلع ہونا (لازم ہے اور عَلٰی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہو جاتا ہے) آیت زیر مطالعہ۔

اَعْثَرَ يُعْثِرُ (افعال) اِعْثَارًا: کسی کو کسی بات پر مطلع کرنا۔ ﴿وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ (الکہف: ۲۱) ''اس طرح ہم نے اطلاع کر دی ان کی۔''

ترکیب : ''شَهَادَةُ'' مضاف ہے ''بَیْنِ'' اس کا مضاف الیہ ہے اور ''کُمْ'' کا مضاف بھی۔ یہ فقرہ مبتدأ ہے اس کی خبر ''اِثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ'' ہے اس لیے ''اِثْنٰنِ'' حالت رفع میں آیا ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ اس میں ''حَضَرَ'' کا فاعل ''الْمَوْتُ'' ہے اور اس کا مفعول ''اَحَدَکُمْ'' ہے۔ ''اِذَا'' کی شرط ''حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ'' ہے اور ''حِیْنَ الْوَصِیَّةِ'' جوابِ شرط ہے۔ ''اِنِ ارْتَبْتُمْ'' کا تعلق ''تَحْبِسُوْنَ'' سے ہے جبکہ ''لَا نَشْتَرِیْ'' کا تعلق ''یُقْسِمٰنِ'' سے ہے۔ ''اَوْلَیٰنِ'' صفت ہے ''فَاٰخَرٰنِ'' کی۔

ترجمہ:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ : اے لوگو جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے
شَهَادَةُ بَیْنِکُمْ : تمہارے مابین کی گواہی	اِذَا : جب کبھی
حَضَرَ : سامنے آئے	اَحَدَکُمُ : تمہارے کسی ایک کے
الْمَوْتُ : موت	حِیْنَ الْوَصِیَّةِ : تو وصیت کے وقت
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ : دو عدل والے ہیں	مِّنْکُمْ : تم میں سے
اَوْ : یا	اٰخَرٰنِ : دوسرے دو ہیں
مِنْ غَیْرِکُمْ : تمہارے غیر میں سے	اِنْ : اگر
اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ : تم سفر کرو	فِی الْاَرْضِ : زمین میں
فَاَصَابَتْکُمْ : پھر آن پہنچے تم کو	مُّصِیْبَةُ الْمَوْتِ : موت کی مصیبت
تَحْبِسُوْنَهُمَا : تم روکے رکھو گے دونوں کو	مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ : نماز کے بعد سے
فَیُقْسِمٰنِ : پھر وہ دونوں قسم کھائیں گے	بِاللّٰهِ : اللہ کی
اِنِ ارْتَبْتُمْ : اگر تمہیں شبہ ہو	لَا نَشْتَرِیْ : (کہ) ہم نہیں خریدتے
بِهٖ : اس سے	ثَمَنًا : کوئی قیمت
وَّلَوْ : اور اگرچہ	کَانَ : وہ ہو
ذَا قُرْبٰی : قرابت والا	وَلَا نَکْتُمُ : اور ہم نہیں چھپاتے
شَهَادَةَ اللّٰهِ : اللہ کی گواہی کو	اِنَّآ : بے شک ہم
اِذًا : پھر تو	لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ : ضرور گناہ کرنے والوں میں سے ہیں
فَاِنْ : پھر اگر	عُثِرَ : مطلع کیا جائے
عَلٰٓی : اس پر	اَنَّهُمَا : کہ وہ دونوں
اسْتَحَقَّآ : مستحق ہوئے	اِثْمًا : گناہ کے
فَاٰخَرٰنِ : تو دوسرے دو	یَقُوْمٰنِ : کھڑے ہوں گے

مَقَامَهُمَا :ان دونوں کے کھڑے ہونے کی جگہ پر
اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ :حق دار ہوا ان پر (یعنی جس کا حق دبایا گیا)
فَيُقْسِمٰنِ :پھر وہ دونوں قسم کھائیں گے
لَشَهَادَتُنَآ :یقیناً ہماری گواہی
مِنْ شَهَادَتِهِمَا :ان دونوں کی گواہی سے
اِنَّآ :بے شک ہم
لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ :ضرور ظلم کرنے والوں میں سے ہیں
اَدْنٰٓى :زیادہ نزدیک ہے
يَّاْتُوْا :لوگ لائیں
عَلٰى وَجْهِهَآ :اس کے چہرے پر (یعنی ٹھیک ٹھیک)
يَخَافُوْٓا :لوگ ڈریں
تُرَدَّ :رد کیا جائے
بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ :ان کی قسموں کے بعد
اللّٰهَ :اللہ کا
وَاللّٰهُ :اور اللہ
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ :نافرمانی کرنے والی قوم کو

مِنَ الَّذِيْنَ :ان لوگوں میں سے جو
الْاَوْلَيٰنِ :زیادہ قریبی (میت کے)
بِاللّٰهِ :اللہ کی
اَحَقُّ :زیادہ برحق ہے
وَمَا اعْتَدَيْنَآ :اور ہم نے زیادتی نہیں کی
اِذًا :پھر تو
ذٰلِكَ :یہ
اَنْ :کہ
بِالشَّهَادَةِ :گواہی کو
اَوْ :یا
اَنْ :کہ
اَيْمَانٌ :(ہماری) قسموں کو
وَاتَّقُوا :اور تم تقویٰ (اختیار) کرو
وَاسْمَعُوْا :اور سنو
لَا يَهْدِى :ہدایت نہیں دیتا

نوٹ: یہ آیت اس وقت اتری جبکہ ایک آدمی مر گیا اور اس وقت وہاں کوئی مسلمان نہ تھا۔ شروع اسلام کا زمانہ تھا' سب شہر دارالحرب تھے' لوگ کافر تھے۔ وراثت کا کوئی قانون نہ تھا' بطور وصیت تقسیم ہوتی تھی۔ پھر وصیت منسوخ ہوگئی اور وراثت فرض ہوگئی اور لوگ قانونِ وراثت پر عمل کرنے لگے۔ (ابن کثیر)

آیات ۱۰۹ تا ۱۱۱

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ اِذْ
قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ
الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ

وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

ح و ر

حَارَ يَحُوْرُ (ن) حَوْرًا : گھومنا' واپس ہونا۔ ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ (الانشقاق:١٤) ''بے شک اس نے گمان کیا کہ وہ ہرگز واپس نہیں ہوگا۔''

حَوِرَ يَحْوَرُ (س) حَوْرًا : آنکھ کی سیاہی اور سفیدی کا بہت نمایاں ہونا' آنکھ کا خوبصورت ہونا۔

اَحْوَرُ مؤنث حَوْرَاءُ ج حُوْرٌ (افعل الوان وعیوب) : خوبصورت آنکھ والا۔ ﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾﴾ (الدخان) ''اور ہم نے جوڑے بنا دیے ان کے خوبصورت آنکھوں والوں/والیوں سے۔''

حَاوَرَ يُحَاوِرُ (مفاعلہ) مُحَاوَرَةً : بات کو واپس کرنا' یعنی (۱) جواب دینا (۲) نصیحت کرنا۔ ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ﴾ (الکہف:۳۷) ''کہا اس سے اس کے ساتھی نے اس حال میں کہ وہ نصیحت کرتا تھا اس کو۔''

حَوَارِيٌّ (اسم نسبت) : نصیحت والا' مددگار۔ آیت زیر مطالعہ۔

تَحَاوَرَ يَتَحَاوَرُ (تفاعل) تَحَاوُرًا : باہم ایک دوسرے کی بات کا جواب دینا' گفتگو کرنا۔ ﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ﴾ (المجادلة:١) ''اور اللہ سنتا ہے تم دونوں کی باہمی گفتگو کو۔''

ترکیب : ''لَا عِلْمَ'' پر لائے نفی جنس ہے اور ''اَلْغُيُوْبِ'' پر لام جنس ہے۔ ''اِذْ قَالَ اللّٰهُ'' کا جملہ ''اِذْ'' سے شروع ہو رہا ہے' اس لیے اس جملہ میں جتنے مضارع آئے ہیں ان سب کا ترجمہ ماضی میں ہوگا۔ (البقرۃ:۱۱-۱۲' نوٹ:۱ دیکھیں) ''كَهْلًا'' حال ہے۔ ''وَاشْهَدْ'' کے مخاطب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اس کا مخاطب خود ذاتِ باری تعالیٰ بھی ہو سکتی ہے۔

ترجمہ:

يَوْمَ : جس دن
اللّٰهُ : اللہ
فَيَقُوْلُ : پھر وہ کہے گا
اُجِبْتُمْ : جواب دیا گیا تم کو
لَا عِلْمَ لَنَا : کسی قسم کا کوئی علم نہیں ہے ہمیں
عَلَّامُ الْغُيُوْبِ : تمام غیبوں کا خوب جاننے والا ہے

يَجْمَعُ : جمع کرے گا
الرُّسُلَ : تمام رسولوں کو
مَاذَآ : کیا
قَالُوْا : وہ کہیں گے
اِنَّكَ اَنْتَ : بے شک تو ہی
اِذْ : جب

قَالَ : کہا
یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ : اے عیسیٰؑ ابن مریم
نِعْمَتِیْ : میری نعمت کو
وَعَلٰی وَالِدَتِكَ : اور آپؑ کی والدہ پر
اَیَّدْتُّكَ : میں نے تقویت دی آپؑ کو
تُكَلِّمُ : آپؑ کلام کرتے تھے
فِی الْمَهْدِ : گہوارے میں
وَاِذْ : اور جب
الْكِتٰبَ : کتاب کا
وَالتَّوْرٰىةَ : اور تورات کا
وَاِذْ : اور جب
مِنَ الطِّیْنِ : گارے سے
بِاِذْنِیْ : میری اجازت سے
فِیْهَا : اس میں
طَیْرًا : اڑنے والا
وَتُبْرِئُ : اور آپؑ شفا دیتے تھے
وَالْاَبْرَصَ : اور کوڑھی کو
وَاِذْ : اور جب
الْمَوْتٰی : مردہ کو
وَاِذْ : اور جب
بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ : بنی اسرائیل کو
اِذْ : جب
بِالْبَیِّنٰتِ : واضح (نشانیاں)
الَّذِیْنَ : ان لوگوں نے جنہوں نے
مِنْهُمْ : ان میں سے
هٰذَا : یہ
سِحْرٌ مُّبِیْنٌ : ایک کھلا جادو
اَوْحَیْتُ : میں نے پوشیدہ پیغام بھیجا

اللّٰهُ : اللہ نے
اذْكُرْ : آپؑ یاد کریں
عَلَیْكَ : آپؑ پر
اِذْ : جب
بِرُوْحِ الْقُدُسِ : روح القدس سے
النَّاسَ : لوگوں سے
وَكَهْلًا : اور ادھیڑ عمری کی حالت میں
عَلَّمْتُكَ : میں نے علم دیا آپؑ کو
وَالْحِكْمَةَ : اور حکمت کا
وَالْاِنْجِیْلَ : اور انجیل کا
تَخْلُقُ : آپؑ بناتے تھے
كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ : پرندوں کی شکل جیسا
فَتَنْفُخُ : پھر آپؑ پھونکتے تھے
فَتَكُوْنُ : تو وہ ہو جاتا تھا
بِاِذْنِیْ : میری اجازت سے
الْاَكْمَهَ : پیدائشی اندھے کو
بِاِذْنِیْ : میری اجازت سے
تُخْرِجُ : آپؑ نکالتے تھے
بِاِذْنِیْ : میری اجازت سے
كَفَفْتُ : میں نے روکا
عَنْكَ : آپؑ سے
جِئْتَهُمْ : آپؑ لائے ان کے پاس
فَقَالَ : تو کہا
كَفَرُوْا : کفر کیا
اِنْ : نہیں ہے
اِلَّا : مگر
وَاِذْ : اور جب
اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ : حواریوں کی طرف

اَنْ : کہ
بِیْ : مجھ پر
قَالُوْٓا : تو انہوں نے کہا
وَاشْهَدْ : اور آپ گواہ رہیں
مُسْلِمُوْنَ: فرمانبرداری کرنے والے ہیں

اٰمِنُوْا : تم ایمان لاؤ
وَبِرَسُوْلِیْ : اور میرے رسول پر
اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے
بِاَنَّنَا : اس پر کہ ہم

نوٹ ۱ : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ رسولوں سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا گیا تھا' تو وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں' غیب کا علم تو صرف آپ کو ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ ہر رسول کی اُمت کے وہ لوگ جو ان کی وفات کے بعد پیدا ہوئے' ان کے بارے میں تو یہ جواب صحیح ہے' لیکن وہ لوگ جو انہی کے ہاتھ پر ایمان لائے اور ان کے احکام کی پیروی ان کے سامنے کرتے رہے' ان کے بارے میں یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا' اس بات کو سمجھ لیں۔

ایک انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے ہونے کے باوجود اس کے ایمان و عمل کی گواہی اگر دے سکتا ہے تو غلبۂ گمان کے اعتبار سے دے سکتا ہے۔ ورنہ دلوں میں نیت اور حقیقی یعنی قلبی ایمان کسی کو وحی الٰہی کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے اور ہر اُمت میں منافقین کے گروہ رہے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اور احکامِ خداوندی کی پیروی کرے' انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اُمتیں ان کو دنیا میں مؤمن کہنے پر مجبور ہیں' خواہ وہ دل میں مؤمن مخلص ہو یا منافق۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم ظاہر پر حکم جاری کرتے ہیں' مخفی رازوں کا متولی اللہ ہے۔''

اسی ضابطہ کے تحت دنیا میں تو انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے خلفاء اور علماء ظاہر پر حسن ظن کے مطابق کسی کے مؤمن ہونے کی گواہی دے سکتے تھے۔ لیکن آج وہ دنیا ختم ہو چکی ہے جس کا مدار ظن و گمان پر تھا۔ یہ میدانِ حشر ہے' جہاں حقائق کو آشکارا کیا جائے گا۔ اس لیے رسولوں کا یہ جواب صحیح ہے کہ ہمیں حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

نوٹ ۲: عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر پھانسی دی گئی تھی۔ یہ بات خلافِ واقعہ ہے' اس لیے قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے متعلق عیسائیوں کا جو عقیدہ ہے' وہ مطابق واقعہ ہے' اس لیے قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔ لیکن ان معجزات کو دلیل بنا کر کچھ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا حامل اور کچھ عیسائی انؑ کو الوہیت میں شریک قرار دیتے ہیں۔ یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے' اس لیے قرآن اس کی بھی تردید کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ وہؑ یہ معجزات اللہ تعالیٰ کی اجازت سے دکھاتے تھے۔

آیات ۱۱۲ تا ۱۱۵

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَیْهَا مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ

اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝

م ی د

مَادَ يَمِيْدُ (ض) مَيْدًا : ہلنا' لرزنا۔ ﴿وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ (النحل:۱۵)
''اور اُس نے ڈالے زمین میں کچھ لنگر (یعنی پہاڑ) کہ کہیں وہ نہ لرزے تم کو لے کر۔''

مَائِدَةٌ (اسم الفاعل) : مَائِدٌ کا مؤنث ہے۔لرزنے والی۔ پھر کھانا چنے ہوئے دسترخوان کے لیے آتا ہے' کیونکہ اس میں چنی ہوئی خوراک مہمانوں کے درمیان ہلتی رہتی ہے۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''اَنْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''تَطْمَئِنَّ ، نَعْلَمَ'' اور ''نَكُوْنَ'' حالت نصب میں آئے ہیں۔ ''تَكُوْنُ'' واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔اس کا اسم اس میں شامل ''هِيَ'' کی ضمیر ہے جو ''مَائِدَةً'' کے لیے ہے' جبکہ ''عِيْدًا'' اور ''اٰيَةً'' اس کی خبریں ہیں۔ ''عَذَابًا'' نکرہ مخصوصہ ہے۔

ترجمہ:

اِذْ : جب	قَالَ : کہا
الْحَوَارِيُّوْنَ : حواریوں نے	يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ : اے عیسیٰ ابن مریم
هَلْ : کیا	يَسْتَطِيْعُ : قدرت رکھتا ہے
رَبُّكَ : آپؑ کا رب	اَنْ : کہ
يُّنَزِّلَ : وہ اتارے	عَلَيْنَا : ہم پر
مَآئِدَةً : ایک چنا ہوا دسترخوان	مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے
قَالَ : انہوںؑ نے کہا	اتَّقُوا اللّٰهَ : اللہ کا خوف کرو
اِنْ : اگر	كُنْتُمْ : تم ہو
مُّؤْمِنِيْنَ : مؤمن	قَالُوْا : انہوں نے کہا
نُرِيْدُ : ہم چاہتے ہیں	اَنْ : کہ
نَّاْكُلَ : ہم کھائیں	مِنْهَا : اس میں سے
وَتَطْمَئِنَّ : اور مطمئن ہوں	قُلُوْبُنَا : ہمارے دل
وَنَعْلَمَ : اور ہم جان لیں	اَنْ : کہ
قَدْ صَدَقْتَنَا : آپؑ نے سچ کہا ہے ہم سے	وَنَكُوْنَ : اور ہم ہو جائیں
عَلَيْهَا : اس پر	مِنَ الشّٰهِدِيْنَ : گواہی دینے والوں میں سے
قَالَ : کہا	عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ : عیسیٰ ابن مریم نے

اللّٰھُمَّ :اے اللہ
اَنْزِلْ :تو اتار
مَآئِدَةً :ایک چنا ہوا دسترخوان
تَکُوْنُ :وہ ہو جائے گا
عِیْدًا :خوشی کا دن
وَاٰخِرِنَا :اور ہمارے پچھلوں کے لیے
مِّنْكَ : تیری طرف سے
وَاَنْتَ :اور تُو

قَالَ : کہا
اِنِّیْ : کہ میں
عَلَیْکُمْ :تم پر
یَّکْفُرْ :ناشکری کرے گا
مِنْکُمْ :تم میں سے
اُعَذِّبُهٗ :عذاب دوں گا اس کو
لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ :(کہ) میں عذاب نہیں دوں گا ویسا
مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ :تمام جہانوں میں سے

رَبَّنَآ :اے ہمارے ربّ
عَلَیْنَا :ہم پر
مِّنَ السَّمَآءِ :آسمان سے
لَنَا :ہمارے لیے
لِاَوَّلِنَا :ہمارے پہلوں کے لیے
وَاٰیَةً :اور ایک نشانی
وَارْزُقْنَا :اور تُو عطا کر ہم کو
خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ : سب سے بہتر عطا کرنے والا ہے
اللّٰهُ :اللہ نے
مُنَزِّلُهَا :اتارنے والا ہوں اس کو
فَمَنْ :پھر جو
بَعْدُ :بعد میں
فَاِنِّیْٓ :تو یقیناً میں
عَذَابًا :ایک ایسا عذاب
اَحَدًا :کسی ایک کو (بھی)

نوٹ : مائدہ کے جس واقعہ کا ان آیات میں ذکر ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جن شاگردوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست تعلیم حاصل کی تھی، وہ ان کو ایک انسان اور اللہ کا بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریک خدا یا فرزندِ خدا ہونے کا تصور نہیں تھا۔ نیز یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۱۱۶ تا ۱۲۰

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ
قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ
مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ
بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ
اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ

تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

ترکیب: ''اَنْ اَقُوْلَ'' کا مفعول ''مَا'' ہے۔ ''لَيْسَ'' کا اسم اس میں ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو ''مَا'' کی ضمیر عائد بھی ہے اور ''بِحَقٍّ'' اس کی خبر ہے۔ ''يَوْمُ'' مضاف ہے اور آگے کا پورا جملہ ''يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ'' اس کا مضاف الیہ ہے۔ اس ترکیب کا اردو میں ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے' اس لیے ''يَوْمُ'' کا ترجمہ ''هٰذَا'' کی خبر کے لحاظ سے کیا جائے گا۔

ترجمہ:

وَاِذْ : اور جب	قَالَ : کہا
اللّٰهُ : اللہ نے	يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ : اے عیسیٰ ابن مریم
ءَ : کیا	اَنْتَ : آپؑ نے
قُلْتَ : کہا تھا	لِلنَّاسِ : لوگوں سے
اتَّخِذُوْنِيْ : تم بنالو مجھ کو	وَاُمِّيَ : اور میری والدہ کو
اِلٰهَيْنِ : دو الٰہ	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ
قَالَ : انہوںؑ نے کہا	سُبْحٰنَكَ : تیری پاکیزگی ہے
مَا يَكُوْنُ : نہیں تھا	لِيْٓ : میرے لیے
اَنْ : کہ	اَقُوْلَ : میں کہوں
مَا : اس کو	لَيْسَ : نہیں ہے جس کا
لِيْ : مجھے	بِحَقٍّ : کوئی حق
اِنْ : اگر	كُنْتُ قُلْتُهٗ : میں نے کہا ہوتا اسے
فَقَدْ : تو یقیناً	عَلِمْتَهٗ : تو نے جان لیا ہوتا اس کو
تَعْلَمُ : تو جانتا ہے	مَا : اس کو جو
فِيْ نَفْسِيْ : میرے جی میں ہے	وَلَآ اَعْلَمُ : اور میں نہیں جانتا
مَا : اس کو جو	فِيْ نَفْسِكَ : تیرے جی میں ہے
اِنَّكَ اَنْتَ : بے شک تو ہی	عَلَّامُ الْغُيُوْبِ : تمام غیبوں کا خوب جاننے والا ہے
مَا قُلْتُ : نہیں کہا میں نے	لَهُمْ : ان سے
اِلَّا : مگر	مَآ : وہی

اَمَرْتَنِیْ :تو نے حکم دیا مجھے
اَنِ :کہ
اللّٰہَ :اللہ کی
وَرَبَّکُمْ:اور جو تمہارا رب ہے
عَلَیْھِمْ :ان پر
مَّا دُمْتُ :جب تک میں رہا
فَلَمَّا :پھر جب
کُنْتَ اَنْتَ :تو تُو ہی تھا
عَلَیْھِمْ :ان پر
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ :ہر چیز پر
اِنْ تُعَذِّبْھُمْ :اگر تُو عذاب دے ان کو
عِبَادُکَ :تیرے بندے ہیں
فَاِنَّکَ اَنْتَ :تو بیشک تُو ہی
الْحَکِیْمُ :حکمت والا ہے
ھٰذَا :یہ
یَنْفَعُ :(کہ) نفع دے گا
صِدْقُھُمْ :ان کا سچ
جَنّٰتٌ :ایسے باغات ہیں
مِنْ تَحْتِھَا :جن کے دامن میں
خٰلِدِیْنَ :ایک حالت میں رہنے والے ہیں
اَبَدًا :ہمیشہ
اللّٰہُ :اللہ
وَرَضُوْا :اور وہ راضی ہوئے
ذٰلِکَ :یہ
لِلّٰہِ :اللہ ہی کے لیے ہے
وَمَا :اور اس کی جو
وَھُوَ :اور وہ
قَدِیْرٌ :قدرت رکھنے والا ہے

بِہٖٓ :جس کا
اعْبُدُوا :تم لوگ بندگی کرو
رَبِّیْ :جو میرا رب ہے
وَکُنْتُ :اور میں تھا
شَھِیْدًا :معائنہ کرنے والا
فِیْھِمْ :ان میں
تَوَفَّیْتَنِیْ :تو نے لے لیا مجھے
الرَّقِیْبَ :نگران
وَاَنْتَ :اور تُو
شَھِیْدٌ :معائنہ کرنے والا ہے
فَاِنَّھُمْ :تو بے شک یہ لوگ
وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ :اور اگر تُو بخش دے ان کو
الْعَزِیْزُ :بالا دست ہے
قَالَ اللّٰہُ :کہا اللہ نے
یَوْمُ :دن ہے
الصّٰدِقِیْنَ :سچوں کو
لَھُمْ :انہی کے لیے
تَجْرِیْ :بہتی ہیں
الْاَنْھٰرُ :نہریں
فِیْھَآ :اس میں
رَضِیَ :راضی ہوا
عَنْھُمْ :ان سے
عَنْہُ :اس سے
الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ :عظیم کامیابی ہے
مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : زمین اور آسمان کی سلطنت
فِیْھِنَّ :ان میں ہے
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ :ہر چیز پر

نوٹ ۱: عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ صرف عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بی بی مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ بی بی مریم کی الوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیل سے بالکل نا آشنا تھی۔ تیسری صدی عیسوی کے آخری دور میں اسکندریہ کے بعض علماء دینیات نے پہلی مرتبہ بی بی مریم کے لیے اُمُّ اللّٰہ یعنی ''مادرِ خدا'' کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُلوہیتِ مریم کا عقیدہ اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا۔ ابتدا میں چرچ اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر ۴۳۱ء میں منعقد ہونے والی کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں بی بی مریم کے لیے مادرِ خدا کا لقب استعمال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا' وہ کلیسا کے اندر بھی پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ نزولِ قرآن کے زمانے تک ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: جنگ بدر کے بعد جنگی قیدیوں کے متعلق جب مشاورت ہوئی تو ایک طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ ان کو قتل کیا جائے۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ ان کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے' شاید بعد میں ان میں سے کوئی ایمان لے آئے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر کی تھی جس میں آپؐ نے فرمایا کہ انسان مختلف طبیعت اور مزاج کے ہوتے ہیں۔ انبیاء میں بھی کچھ سخت مزاج اور کچھ نرم مزاج تھے۔ سخت مزاج انبیاء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی مثال دی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ زمین پر کوئی بسنے والا کافر مت چھوڑ۔ (نوح: ۲۱ تا ۲۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ فرعون کے مال و دولت کو نیست و نابود کر دے۔ (یونس: ۸۸) نرم مزاج انبیاء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی مثال دی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو پھر بھی تو غفور رحیم ہے۔ (ابراہیم: ۳۶) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا زیر مطالعہ آیت ۱۱۸ میں ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم کے ترجمہ قرآن کیسٹ سے ماخوذ)

نوٹ ۳: عام طور پر واقعہ کے مطابق بات کو سچ اور خلافِ واقعہ بات کو جھوٹ کہا جاتا ہے' لیکن قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق اور کذب قول اور عمل دونوں کو شامل ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو آدمی علانیہ اچھی طرح نماز پڑھتا ہے اور وہ تنہائی میں بھی اسی طرح ادا کرتا ہے تو ایسے آدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرا سچ مچ بندہ ہے۔ (مشکوٰۃ' منقول از معارف القرآن)

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مفلس کون؟

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ ؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :

((اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟)) قَالُوْا اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ' فَقَالَ : ((اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِیَامٍ وَزَکَاةٍ وَیَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَاَکَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا ' فَیُعْطٰی هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ ' فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ))(۱)

حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: مفلس ہم اس شخص کو سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ اور مال ومتاع نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری اُمت میں مفلس وہ انسان ہے جو قیامت کے دن نماز' روزہ' زکوٰۃ اعمال کے ساتھ آئے گا لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہوگی' کسی پر تہمت طرازی کی ہوگی' کسی کا مال کھایا ہوگا' کسی کا خون گرایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا تو اس مظلوم کو اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی۔ اور اگر اس کے مظالم کی ادائیگی سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان مظلوموں کی غلطیاں اس پر ڈال دی جائیں گی اور اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔''

اس حدیث میں حقوق العباد کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نماز روزہ کی پابندی ضرور کرنا چاہیے' مگر اخلاقی برائیوں سے بچنا اور دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بننا انتہائی ضروری ہے' ورنہ جزا وسزا کے دن رسمی عبادات بھی چھین لی جائیں گی۔

حضور اکرم ﷺ کا انداز تھا کہ سامعین کو متوجہ کرنے کے لیے اکثر آپؐ سوالیہ انداز میں بات کرتے۔ صحابہ کرام ؓ کبھی جواب دیتے اور کبھی لاعلمی کا اظہار کرتے اور آپؐ کی گفتگو سننے کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حاضرین صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں تو مفلس اسے کہتے ہیں کہ جس کے پاس نہ نقدی ہو اور نہ کوئی مال واسباب۔ اس پر آپؐ نے فرمایا نہیں' بلکہ میری اُمت کا مفلس تو وہ ہے جو دنیوی زندگی میں نیکیاں تو بہت کما کر لایا ہوگا' مگر اُس کے اخلاق اور کردار میں احتیاط نہ ہوگی' اس نے حقوق العباد تلف کیے ہوں گے۔ قیامت کے دن حساب کتاب کے وقت جب متاثرین اس سے اپنے حقوق مانگیں گے تو وہ کچھ بھی نہ دے سکے گا۔ چنانچہ حق داروں کو ان کے حقوق کے بدلے

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔

اس شخص کی نیکیاں دی جائیں گی۔ مطالبہ کرنے والے اتنے لوگ ہوں گے کہ اس شخص کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور ابھی حق دار باقی ہوں گے۔ ان حق داروں کو ان کے حق کے بدلے نیکیاں تو نہ مل سکیں گی مگر عدل کا تقاضا تو پورا کرنا ہوگا' چنانچہ ان کے گناہ اس حق تلف کرنے والے کے سر ڈال کر انہیں خوش کیا جائے گا۔

اس حدیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ نماز' روزہ اور دوسرے نیک کام نیکیوں کے انبار لگا دیتے ہیں' مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ یہ نیکیاں چھن جائیں گی بلکہ دوسروں کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے اور پھر اس کے پاس دوزخ سے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوگی۔ ایسا آدمی ہی حقیقی مفلس ہے جو دنیا میں لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا رہا' ان کو نقصان پہنچاتا رہا' ان کا مال دھوکے سے کھاتا رہا' رشوت لیتا رہا' جھوٹ بولتا اور غیبت کرتا رہا' چوری اور ڈاکے ڈال کر لوگوں کا مال ہتھیاتا رہا۔ قیامت کے دن اسے ان حق داروں کے حقوق ادا کرنے ہوں گے جو وہ ادا نہ کر سکے گا۔ نتیجتاً وہ بے بسی اور لاچاری کے عالم میں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

دنیا میں بالعموم اس شخص کو نیک اور متقی سمجھا جاتا ہے جو نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا ہے خواہ اس کی عملی زندگی کیسی بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نمازیں اور روزے اسی صورت میں کام آئیں گے جب حقوق العباد کے سلسلہ میں آدمی ہر طرح کی بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں سے بچتا رہا ہوگا۔ چور یا رشوت خور دوسرے کا مال چھین کر خوش ہوتے ہیں' جس کا مال چوری ہوتا ہے یا جو رشوت دینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے وہ تو پریشان اور غمگین ہوتا ہے کہ میرا مال چھین لیا گیا۔ لیکن یہ بندہ اس وقت خوش ہوگا جب اس کو روپے پیسے یا مال کے بدلے میں نیکیاں ملیں گی یا اس کے گناہ دور کر دیے جائیں گے۔ سچ ہے کہ دنیا ''متاع الغرور'' ہے۔ یہاں جس نے ناجائز طریقے سے دولت کمائی ہے اور جائیداد کا مالک بن گیا ہے جب اس سے دنیا میں لوٹی ہوئی دولت کے بدلے اس کی نیکیاں چھین لی گئیں' حتیٰ کہ اس کے ذمہ دوسروں کے گناہ ڈال دیے گئے تو ایسا آدمی حقیقت میں مفلس اور کنگال ہے۔ اگرچہ دنیا میں وہ مال دار' معزز' خوشحال اور متّقی مانا جاتا ہو' لیکن ایسے آدمی کو ہی نبی اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کا مفلس بتایا ہے۔

دنیا کی زندگی میں دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھانا ہی برائی نہیں بلکہ حدیث کی رو سے کسی دوسرے شخص کے ساتھ بدسلوکی کرنا' گالی دینا' غیبت کرنا یا کسی بھی طرح کی بدخواہی کرنا بھی انسان کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گا اگرچہ اس نے دنیا کی زندگی میں عبادت کر کے کتنی ہی نیکیاں کمائی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مؤمن وہ ہے جو دوسروں کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی شخص نہیں چاہتا کہ اس کا نقصان ہو' پس اسے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے' ورنہ ایسا کام اُس کی نماز روزے وغیرہ سے کمائی ہوئی نیکیاں رائیگاں کر دے گا۔ الغرض ہر شخص کو اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ نیک کام تو وہ کر رہا ہے' مگر اس بات کا بھی خیال رکھے کہ مجھ سے ایسا کوئی فعل سرزد نہ ہو جو میری ان نیکیوں کو برباد کر دے اور مجھے بے چارگی کے عالم میں دوزخ کی آگ میں جانا پڑ جائے' ورنہ حقیقی ناداری اور مفلسی یہی ہوگی۔

اسلام اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ چیلنجز؟

جناب احمد جاوید کی گفتگو

مناسب ہے کہ میرے ذہن میں دو دن کی گفتگو کا جو خاکہ ہے وہ آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ مخاطب بننے کے لیے جو ایک ذہنی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اور ذہن کو کسی خاص جہت اور کسی خاص مطالبہ پر استوار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے' وہ بھی اس طرح پوری ہو جائے اور ہماری گفتگو کے حدود اور مقاصد بھی واضح ہو جائیں۔ مجھے محترم حافظ عاطف وحید صاحب نے جو موضوع تفویض فرمایا ہے وہ ہے ''اسلام اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ چیلنجز؟''

میں ان شاء اللہ اِن چیلنجز کی تفصیل بیان کروں گا' اور ان کی نوعیت اور کیٹگری کو معین کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ اس سارے بیان کا دوسرا اور اہم تر حصہ یہ ہے کہ سلامتی کے ساتھ اور حق پر کھڑے ہو کر ہم ان چیلنجز سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ ان دونوں جہتوں سے ہمارے ذہن کو ایک مقصدی جذبہ کے ساتھ پہلے سے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ موضوع اپنے اندر ایک ایسی چیز ضرور رکھتا ہے کہ جسے نظر انداز کر کے ہم اپنے دین اور اپنے بنیادی عقائد کے ساتھ' نیز ذہن کے اطمینان' قلب کی تسکین' اور ارادے کی یکسوئی کے ساتھ..... کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس اعتبار سے میری نظر میں تو یہ ہماری موت وحیات کا مسئلہ ہے۔

اجمالی خاکہ یوں ہے کہ ہمیں دو طرح کے چیلنجز درپیش ہیں۔ دو طرح کے ایسے خطرات درپیش ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کریں تو ہم اپنے دین کے ناکام اور بے اثر ترجمان بن کر رہ جائیں گے۔ ان چیلنجز کی دو انواع یعنی دو قسمیں ہیں..... یعنی ایک باہر سے درپیش چیلنج اور بہت سادہ لفظوں میں' مغرب سے..... جو دنیا کی عملی' مادّی' انتظامی اور علمی تشکیل کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ آج دنیا اپنی تعریف کے لیے جن بنیادی اجزاء کی خواست گار ہے' (یعنی جن بنیادی اجزاء کے ساتھ دنیا کو مؤثر (effective) طریقہ سے define کیا جا سکتا ہے)' اُن تمام عناصر اور اجزائے تعریف پر کُل کا کُل تصرف مغرب نے حاصل کر لیا ہے۔ اس بات کو مانے بغیر اور اس بات کو ایک تلخ حقیقت کے طور تسلیم کیے بغیر' ہم اپنے موقف کی ایسی تشکیل نہیں کر سکتے جو موجودہ زمانے پر اثر انداز ہو سکے' اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے دین سے تعلق اور اس کی ترجمانی کی بُہتیری یا اکثر ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے ہیں۔

جو چیلنجز ہمیں درپیش ہیں اُن کی فہرست یوں ہے:

۱۔ مغرب سے درپیش وہ چیلنجز جنہوں نے ہماری بقا کے ساتھ ساتھ ہمارے تصورِ دین تک کو متاثر کیا ہے۔

ب۔ وہ داخلی چیلنجز جو ہمارے ہی اندر سے اُٹھ رہے ہیں اور دینی فکر اور دین کے پورے discourse پر اور دین کی تمام اقلیموں پر غالب آجانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ داخلی چیلنجز خطرے کے اعتبار سے زیادہ شدید ہیں' اور یہ داخلی چیلنجز اُن چیلنجز کا انعکاس ہیں جو مغرب نے ہم پر مسلط (impose) کیے ہیں..... یا..... مغرب سے پیدا ہوئے ہیں۔

آج کی گفتگو بیرونی چیلنجز کے بارے میں ہے اور اگلی گفتگو میں' ان شاءاللہ' ہم اپنے ذہن کو داخلی مسائل پر مرتکز رکھیں گے..... اس نیت کے ساتھ کہ ہم ان دونوں طرح کے چیلنجز کا کامیابی کے ساتھ سامنا کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر سکتے ہیں؟ یعنی اپنی دینداری کے موجودہ احوال میں کس طرح کی اصلاحات لا کر ایسے مہلک چیلنجز اپنے اوپر اوّلاً بے اثر بنا سکیں اور ثانیاً اُن پر غالب آسکیں؟ یہ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ میں عالم نہیں ہوں۔ میں علماء کے درمیان بیٹھ کر یہ تو محسوس کرتا ہوں کہ جیسے ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کو گویا دوبارہ پانی مل گیا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ممکن ہے کہ مجھے ایک عامی کی حیثیت سے' جو اپنے دین کے ساتھ وابستگی میں حتی المقدور مخلص ہے' اور اپنے دین کے ساتھ وابستہ رہنے کے لیے ایک سازگار ماحول کا طلب گار ہے' وہ سازگار ماحول میسر آجائے جو آپ لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوگا..... ان شاءاللہ!

تمہیداً عرض کر دوں کہ ابھی جن چیلنجز کی بات کی ہے اگر اُن کی فہرست بنائی جائے' اور اُس فہرست کو ابواب میں تقسیم کیا جائے تو وہ تین یا چار قسم کے چیلنجز ہیں... چاہے وہ خارج سے وارد ہوئے ہوں یا وہ خارج سے نکلے ہوں۔ ان میں کچھ چیلنجز علمی ہیں۔ علمی سے مراد یہ کہ مغرب نے ایک نظام العلم تشکیل دیا ہے... ایک knowledge order بنایا ہے۔ اور اُس نے نظام العلم کو ذہن اور دنیا کے درمیان تعلق پیدا کرنے کی ایک واحد مؤثر اساس بنانے میں کامیابی حاصل کر دکھائی ہے۔ اس طرح کے جو علمی چیلنجز ہمیں درپیش ہیں اگر اُنہیں address نہ کیا گیا... معرفتِ حق اور شعورِ ایمانی کی بہترین قوتوں کے ساتھ اُن کا مقابلہ نہ کیا گیا... تو پھر ہمارا دین ہمارے حافظے تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور ہمارا ایمان ہمارے شعور میں بہترین احوال سے غیر متعلق رہ جائے گا۔ ان چیلنجز کو خواہ کسی بھی وجہ سے نظر انداز کیا گیا... خود پسندی یا جذباتیت کی نذر کیا گیا... تو نتیجتاً ہمارا ذہن اپنی بہترین سطحوں پر دین کے چشمہ سے سیراب ہونا بھول جائے گا۔ ہمارا شعور اس بات سے قاصر رہ جائے گا کہ وہ دین یا ایمانیات کو اپنا ایسا بنیادی تناظر اور perspective بنا سکے جس اساسی تناظر اور perspective principle سے دنیا اور آدمی کو سمجھنے والے علوم پیدا ہوتے ہیں۔ تو یہ ہے اس موضوع کی اہمیت! آج اسی موضوع پر تفصیل سے بات کرنی ہے۔

۱) علمی چیلنجز

ہمیں درپیش علمی چیلنجز سے آغاز کرتے ہوئے میں ایک بات عرض کروں گا کہ ایک اصطلاح ہے ''Episteme''... جس کا ترجمہ تو شاید نہ ہو سکے' اس کو کھول کر بیان کرنے سے شاید وہ واضح ہو جائے' ان شاءاللہ! Episteme کا لفظی مطلب علم ہے' لیکن اس کا اصطلاحی مطلب زیادہ وسیع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مزاجِ

علم‘ حدِ علم‘ صورتِ علم اور ضرورتِ علم۔ جب یہ سب اصطلاحیں ایک تہذیب میں یک جا ہو جائیں تو اُنہیں اُس تہذیب کا episteme کہا جائے گا۔ یہ اس تہذیب کا وہ علمی جوہر ہے جس سے اس کی تمام معلومات جنم لیتی ہیں... جس کی روشنی میں اس تہذیب کا مجموعی ذہن مختلف خیالات اور نظریات کی تشکیلِ نو یا تجدید کرتا رہتا ہے۔

تو اس پہلو سے ہمیں جس بہت بڑی مصیبت‘ بہت ہی بڑی رکاوٹ کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب نے (یعنی مغربی علم‘ مغربی Episteme نے) ’’علم‘‘ اور ’’معلوم‘‘ کے درمیان ربط کو (یعنی علم اور object کے درمیان نسبت کو) اتنا متعین‘ اتنا متجر اور اتنا فکسڈ کر دیا ہے کہ آج دنیا اپنی علمی form میں‘ اپنی واقعی حیثیت اور اپنی ذہنی صورت میں‘ اپنے وجود میں‘ اور دنیا اپنے شعور میں بھی ایسی بن کر رہ گئی ہے کہ جس میں کسی بھی طرح کی مابعد الطبیعیات کی گنجائش اور ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ آج مغرب نے انسانی ذہن کو اس طرح craft کر دیا ہے اور دنیا کو اس طرح اپنے ذہن میں تعمیر کر لیا ہے اور دنیا کو ایسی تعریفات اور definitions دے دی ہیں کہ جس کے نتیجہ میں خدا کو ماننے اور دین پر چلنے کی روایت تیزی سے اجنبی‘ غیر مطلوب‘ اور غیر مؤثر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ سب سے بڑا خَلا جو مغرب کامیابی کے ساتھ ایکسپورٹ کر رہا ہے وہ خَلا یہی ہے کہ اُس نے انسانی شعور اور انسانی دنیا کو ایک ایسا روپ دے دیا ہے اور اُسے ایسے ماحول میں بدل دیا ہے‘ جہاں خدا کی جگہ بنانے کے لیے تکلف کرنا پڑتا ہے‘ جہاں دین کو ماننے کے لیے ایک اجنبی پن کے احساس سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ ہم مسلم سوسائٹیز کی روایتِ علم میں دیکھ رہے ہیں —— یہ صرف ایک مفروضہ نہیں ہے۔ اس کا اثر خود مسلم ذہن اور مذہبی ذہن پر پڑا ہے —— اس کی تفصیلات اس طرح ہیں:

آج مغرب نے دنیا کو اس کے واقعی structure میں اور دنیا کو اس کی conscious form میں انسان کے اپنے بارے میں تصور کو اتنا زیادہ بدل دیا ہے کہ انسانی ذہن کے لیے ایمان نامانوس ہو کر رہ گیا ہے۔ عملِ صالح کے لیے دنیا ایک اجنبی جگہ بن کر رہ گئی ہے۔ یعنی ہم دنیا میں وہ جگہ ڈھونڈ نکالنے میں مشکل محسوس کرنے لگے ہیں جہاں ہم خدا کو مرکز بنا کر‘ حاکم بنا کر‘ معبود بنا کر اور خالق بنا کر رکھ سکیں‘ مان سکیں اور منوا سکیں‘ اور جہاں دین کے دیے ہوئے بنیادی تناظرات چیزوں کو دیکھنے کا واحد ذریعہ ہوں۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ انسان کا تجزیہ کرنے والے اور دنیا کے mechanics تک رسائی کی کوشش کرنے والے تمام جدید علوم ‘بن کہے اس بات پر متفق ہیں کہ اُنہوں نے شے کی ساخت‘ شعور کی بناوٹ اور مزاج کو ایسا بنا دیا ہے کہ خدا ایک آئیڈیا اور ایک تصور کے طور بھی غیر مؤثر اور irrelevant ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ایسا خطرہ نہیں کہ اس میں صرف اہلِ مغرب مبتلا ہیں... اُن کے لیے تو یہ کامیابی ہے۔ اس خطرہ میں جدید تعلیم یافتہ مسلم ذہن بھی گرفتار ہو چکا ہے اور اس خطرے کے پھیلاؤ اور تاثیر کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اب یہ خطرہ مذہبی ذہن کے دروازہ پر بھی دستک دے رہا ہے۔ یہ کون سا خطرہ ہے؟ یہ کہ خدا کو ماننا فطری نہ لگے‘ خدا کی اطاعت جبر بن کر رہ جائے‘ اور خدا کے ساتھ تعلق کے تمام مظاہر کسی بھی worldview کی تشکیل میں درکار ہی نہ رہیں۔ تو یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے! اس علمی خطرے کے مائی باپ علم کے ہر شعبے اور ہر discipline میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theory) —— جو کسی بھی طرح سے سائنسی تیقن حاصل کرنے میں تا حال

ناکام ہے‘ اور آپ اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں —— اس تھیوری کا اصل مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ کائنات تخلیق نہیں کی گئی‘ کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے‘ یہ ایک سپر نقطہ (super dot) یا ذرہ تھی‘ ایک ناقابل پیمائش نقطہ‘ جس میں ٹائم اور space وغیرہ مجتمع تھے‘ سب منجمد تھے‘ سموئے ہوئے تھے۔ کسی وجہ سے وہ نقطہ پھٹ کر غبارے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس نقطے کے بلاسٹ کر جانے اور داخلی انفجار سے زمان و مکان اور یہ ساری کائنات وجود میں آئی ہے۔ اس نظریہ کی سائنسی تفہیم اس وقت ضروری نہیں ہے۔ میں صرف اس کا نتیجہ عرض کرتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بگ بینگ کے محض امکان کو بھی مان لینے کے نتیجہ میں کائنات کو مخلوق جاننا اور ماننا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ پہلا حملہ ہے۔ دوسرا حملہ ہے نظریہ ارتقاء‘ یعنی ڈارون کی تھیوری آف بائیولوجیکل ایوولیوشن (evolution)۔ مغرب میں جو چیزیں عقیدے کے سے تحکم اور استقلال کے ساتھ مانی جاتی ہیں ان میں ایک نظریہ ارتقاء بھی ہے جو ڈارون کا ہے۔ نظریاتِ ارتقاء اور بھی ہیں... سپنسر وغیرہ کے‘ لیکن ڈارون کا نظریہ ارتقاء یہ ہے کہ انسان ایک Natrual Selection‘ ایک فطری اتفاق سے بنا ہے‘ یہ مخلوق نہیں ہے! جس طرح بگ بینگ تھیوری کائنات کے مخلوق ہونے کی نفی میں سب سے بڑی دلیل بن رہی ہے‘ اسی طرح ڈارون کا نظریہ ارتقاء انسان کے مخلوق ہونے پر بہت بڑا سوالیہ نشان لگا چکا ہے۔ اور مغربی ذہن کی اکثریت نے یا اس مغربی ذہن نے جو دنیا پر اس وقت علمی اور عملی طور پر قدرت رکھتا ہے‘ اُس عملی اور مجموعی ذہن نے ان دو نظریات کو قبول کر رکھا ہے —— اور مغرب کے انسان اور دنیا کے بارے میں پیدا ہونے والے تمام علوم ان دو بنیادوں سے پھوٹتے ہیں۔ یعنی انسان کا تجزیہ کرنے والا علم چاہے وہ Anthropolgy کا کوئی علم ہو یا نفسیات کا کوئی علم ہو‘ ان سب میں اس چیز کو ایک بنیادی مسلّمہ کے طور پر قبول کیا جاتا ہے کہ آدمی ایک نوع سے دوسری نوع میں شفٹ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے‘ کسی ''امرکُن'' کے نتیجے میں بنی بنائی حالت میں یہاں نہیں اتارا گیا۔ تو انسانوں کا مطالعہ کرنے والے گویا تمام علوم اس کی نفسیاتی ساخت میں سے مخلوقیت کے جوہر کو منہا کر دینے پر متفق ہیں۔ کیا یہ کم خطرہ ہے؟ یہ وہی نفسیات ہے جس کو پڑھ کر ہمارے یہاں لوگ سائیکیٹریسٹ اور سائیکولوجسٹ بنتے ہیں۔ یہ وہی بگ بین نظریہ ہے جس کو مانے بغیر آپ کو فزکس کی کسی کلاس میں داخلہ نہیں ملے گا۔ مطلب یہ کہ اُن کا زور‘ دباؤ‘ پھیلاؤ اور اُن کی تسلیم اب بہت زیادہ مضبوط اور تقریباً غیر مشروط ہے۔

تیسرا خطرہ یہ ہے کہ مغرب نے اپنی بہترین فلسفیانہ قوتوں کے ساتھ جو سماجی اور سیاسی علوم کی روایت شروع کی... یعنی فلسفہ اور سوشیالوجی وغیرہ... تو اس کا ایک نتیجہ جو ہمارے ذہن پر مرتب ہوا‘ جس نے ہمارے شعور کو اس کی اصلی بنیاد اور ساخت سے اکھاڑ دیا... اور یہ ممکن ہی نہیں کہ جسے ہر انسانی دماغ محسوس نہ کر سکے‘ اس کا ادراک نہ کر سکے‘ اُسے realise نہ کر سکے‘ اور اگر مزاج دینی ہے تو اس پر پریشان نہ ہو... وہ یہ ہے کہ ہمارے شعور میں عقیدہ اور علم کو جوڑنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ ہمارا ایمانی شعور خود ہمارے لیے مؤثر طور پر (convincingly) مدلّل نہیں رہ گیا ہے۔ اللہ کو ماننا... اُس کی تمام شانوں کے ساتھ... ہمارے اندر شعور کی بہترین activities کو جنم نہیں دے رہا۔ ہمارا ایمان دنیا اور انسان کے بارے میں علوم کی بنیاد نہیں بن رہا۔ ہمارا ایمان ایک ایسی منطق کو ہمارے ذہن میں جنم نہیں دے رہا جو ایمانیات کا علمی دفاع کرنے کے قابل ہو‘ یا جو خود

ایمانیات کو ہمارے ذہن کی بہترین طاقتوں کے لیے fulfilling اور قابل تسلیم اور محبوب بنا سکے۔ یعنی ایمان ذہن کی ایک ضد سے زیادہ اپنے وجود کے شواہد نہیں رکھتا۔ یہ میں علمی پہلو سے کہہ رہا ہوں۔ گویا اگر علم کی جہت سے دیکھا جائے تو آج ہمارے علماء کا ایمان بھی' اِلا ماشاء اللہ' ذہن کی بہترین حالتوں کو capture کرنے کے قابل نہیں ہے اور ایسا فطری استدلال' ایسی natural fineness اور ایسا جمالیاتی تموج نہیں رکھتا جو میرے شعور کے تمام گوشوں کو ایک حالتِ سیرابی میں رکھے' اور میرے ایمان پر اُٹھنے والے ہر سوال کو اُس سوال سے اشتراک رکھنے والی منطق کے وسیلے سے حل کر سکے۔ پورے عالمِ اسلام کی سطح پر یہ ایک اتنا بڑا بحران ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا نہ صرف یہ کہ بے وفائی ہے بلکہ اقدامِ خودکشی ہے۔ قومیں قتل سے نہیں خودکشی سے مرتی ہیں۔ تو ویسٹ کا غلبہ ہمیں آمادۂ خودکشی کر چکا ہے' کیوں کہ یہ ایمان کے فطری تقاضوں اور ایمان کے اندر علوم سازی کی جو رَو چل رہی ہے' مغرب کے اس غلبے نے ہمیں اس سے غافل بلکہ محروم کر رکھا ہے۔ یہاں آپ کے سامنے بھرپور اور زوردار انداز میں یہ شکایت رکھی جا رہی ہے تا کہ شکایتوں کو حل کرنے والا ذہن اس کی طرف جلدی سے اور رغبت کے ساتھ متوجہ ہو سکے۔ ایمان کیا ہے؟ ایمان کہتے ہیں شعور کو ایک ایسا حتمی تخیل (binding idea) فراہم کر دینا... شعور کو ایک ایسا ہمہ گیر عقیدہ فراہم کر دینا... کہ شعور اس عقیدہ کو اپنی رگ رگ میں رچا بسا کر علوم سازی کا کام کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ یعنی ایمان ایک اعلیٰ ترین سطح پر متاعِ شعور بنے اور اپنی فعال حالت میں دنیا اور آدمی یا انسانوں کے لیے درکار تمام علوم کی تشکیل کا واحد سبب اور اکیلی سند بن کر دکھائے۔ یہ کام وہ تھا جو ہمارے اَسلاف نے بہت کامیابی سے صدیوں تک کر کے دکھایا ہے۔ لیکن آج ہم اس خلا میں رہتے ہوئے بھی اس خلا میں رہنے کے احساس سے محروم ہیں۔

چوتھے یا تیسرے سبب کا ایک ضمنی مظہر یہ ہے کہ آج مغرب (یعنی دنیا) کو علمی اور عملی طور پر چلانے والی قوت کو' نیز مغرب میں تمام علوم وفنون' تمام تہذیبی اَقدار' تمام اخلاقی آئیڈیاز کو بہت مہارت سے اس طرح کرافٹ کیا جا رہا ہے اور اس طرح ڈیزائن کیا جا رہا ہے کہ ان کو قبول کرنے کے نتیجے میں خدا کا انکار واجب ہو جائے۔ آج مغرب میں علم کا جو بنیادی دھارا (main stream) ہے' اُس بنیادی دھارے کی تشکیل کرنے والے تمام علوم میں دو رویے گویا پکارتے اور چیختے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ دو رویے ہیں: یا تو خدا کا انکار کرنا یا خدا سے لاتعلق رہنا! چنانچہ خدا کا انکار اور خدا سے لاتعلقی کا یہ رویہ گویا ایک عالم گیر نظامِ تعلیم (Global knowledge order) کی بنیاد اور مقصود کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے جو ہم حاصل کر رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارا ذہن جدید تعلیم کے جتنے زیادہ مدارج طے کرتا جاتا ہے اُتنا ہی وہ خدا سے نامانوس یا بیزار ہوتا چلا جاتا ہے۔ کوئی تو وجہ ہے نا؟ کیا وجہ ہے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ ذہن اپنے دین کو بہترین علم کی حیثیت دینے میں ناکام ہے۔ اپنے دین کو اپنے مجموعی شعور کے مرکز میں پوری فعالیت (activity) اور نتیجہ خیزیت (productivity) کے ساتھ وابستہ رکھنے میں ناکام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم خدا کو طالب علم کا کوئی مسئلہ نہیں رہنے دیتی۔ جدید تعلیم اپنے اصلی مزاج میں (وہی جو سرسید سے شروع ہوئی) دین سے لاتعلقی کی تعلیم ہے۔ جدید تعلیم' چاہے وہ سائنس کی ہو یا سوشل سائنس کی' اُن کا مشترک وصف یہ ہے کہ یہ شعور کے مزاج میں

سے ایمان کی ضرورت کو خارج کر دیتی ہے۔ آج ہم نے ان رجحانات سے نمٹنے' ان پر غالب آنے اور اُنہیں روکنے کی کوشش نہ کی تو پھر اس دین کے ساتھ تعلق کی تمام ہیئتیں یا تو عادات کے درجے پر رہ جائیں گی یا پھر مشینی (mechanical) اور جبری ہو کر رہ جائیں گی۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ایسے لوگ جو دین کے دائرے میں تعلیم و تعلّم کا کام (ان شاء اللہ) اخلاص کی بلند سطح پر ہو کر کر رہے ہیں' اُن حضرات سے یہ توقع کی جانی غلط نہیں ہے اور اُن کی جناب میں یہ درخواست گزارنی غلط نہیں ہے کہ خدا کے لیے تعلیم کے اس مزاج کے پھیلاؤ کو روکیں... ورنہ یہ مزاج پھیلتے پھیلتے دینی اداروں میں بھی داخل ہو جائے گا' اور کہیں کہیں یہ داخل ہو چکا ہے..... خدا سے بے نیازی کا' خدا سے بے رغبتی کا' خدا سے بیزاری کا' خدا سے لاتعلقی کا' اور کہیں خدا کے ڈائریکٹ انکار کا!

ہماری سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین کو شعور کی ہر نوع پر غالب رکھنے کی جدوجہد سے دستبرداری حاصل کر لی ہے۔ یعنی یہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اپنے دین کو ذہن کی تشکیل کا سبب اور اخلاق کی تعمیر کا وسیلہ اور منزل بناتے۔ لیکن اس کی طرف سے غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ذہن کو تعمیر اور اخلاق پیدا کرنے والے تمام ذرائع دینی ہاتھوں کی گرفت سے نکلتے چلے جا رہے ہیں... اور... بخدا نکلتے چلے جا رہے ہیں! مطلب یہ ہے کہ جو بھی اس کے خلاف بولے گا وہ یا تو ضد کرے گا یا جھوٹ بولے گا۔ آج ہماری دین داری کے تمام ادارے اور تمام روایتیں ایمان کو اُمّ العلوم اور اُمّ الاخلاق بنانے میں ناکام ہیں۔ آج ہمیں اگر علم کا (یعنی شعور کی بلندی کا) کوئی نمونہ ڈھونڈنا ہوگا تو وہ دینی حلقوں میں نظر نہیں آتا۔ چنانچہ آج اگر اخلاقی برتری کا کوئی نمونہ ڈھونڈنا ہوگا تو وہ دین دار لوگوں کے حلقے کی نسبت دین داری کی روایت سے باہر والے لوگوں میں زیادہ شدت اور تاثیر کے ساتھ نظر آتا ہے۔ جن اصولوں کی بنیاد پر ہمارا دین اخلاقی وجود کی سیرابی کرتا ہے' ان اصولوں سے سب سے زیادہ انحراف اس دین کے خود ساختہ ترجمانوں نے کیا ہے۔ ہمارے اس دعویٰ' کہ ہمارا دین ہمارے شعور کی تعمیر و تکمیل کا واحد ضامن ہے' کی تکذیب کا عملی مظاہرہ جس حلقے میں سب سے زیادہ ہو رہا ہے وہ وہی ہے جو دینی ذہن رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ذہانت اور اَخلاق میں برتری حاصل کیے بغیر ہم معاصر دنیا میں مخالف و متصادم رجحانات' اقدار اور مزاج کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ یا تو اس لہر میں بہہ جائیں یا اس لہر کے سامنے بند باندھیں... تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یا تو مغرب کی اُٹھائی ہوئی اس طغیانی کے آگے مٹی کے گھروندے کی طرح ڈھے جائیں' یا پھر اس طغیانی کے مقابلے کے لیے ڈٹ جائیں' تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ غیر جانب دار رہنے کے لیے جو neutral zones ہوا کرتے تھے' اب دنیا میں ایسا کوئی zone نہیں رہا جس میں ہم پناہ لے کر اس یلغار سے بچ سکیں۔ چنانچہ اس میں بہت جلدی اور بہت اخلاص کی ضرورت ہے۔ اس میں ایمان اور علم کے درمیان تعلق کی اور اس روایت کی تجدید اور احیاء کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف کے ہاں نظر آتی ہے۔ اور ہمیں اس بات کی بہت ہی زیادہ حاجت ہے کہ ہم اپنی ذات سے ثابت کریں کہ یہ دین انسان کو ''اخلاقی وجود'' کس طرح بناتا ہے؟ یہ دین تہذیب کو اس کی اَقدار کیسے فراہم کرتا ہے؟ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان اقدار کو عمل میں آتے ہوئے دکھائیں۔ غرض یہ حقیقت کہ یہ دین انسانی دنیا میں اخلاق کا مقوم اور اقدار کا بانی کس طرح

ہے' یہ ہمیں صرف نظریاتی طور پر ماضی کی ایک یاد کے nostalgic پیرائے میں اور مفلسانہ تکبر' خود پسندی' اور جاہلانہ گھمنڈ اور ضد کے ساتھ ثابت نہیں کرنا ہے... ہمیں اپنے دین کی اخلاقی اور ذہنی نتیجہ خیزی کو اپنی ذات سے' اپنے اداروں سے' اپنی معاشرت سے' ہر صورت میں ثابت کرنا ہے! اور اگر اس میں ہم نے ذرا بھی دیر کر دی تو اگلی نسلوں کے لیے دین کو ماننا بوسنیائی مسلمانوں کی طرح ایک کلچرل ایکٹیویٹی تو رہ جائے گا' اس سے آگے اُس کی کوئی معنویت اور تاثیر نہیں رہے گی۔ تو خدا کے لیے اپنی تمام ترضمنی اور فروعی مصروفیات کو چھوڑ کر اس طرف پلٹیں۔ اس کام کو کرنے کے لوازم حاصل کریں' وسائل حاصل کریں' اور اس کام کو عمدگی سے' کامیابی سے' انجام دینے والی قابلیت اور مہارت (skill) پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

ایک مفکر' ایک ملحد مفکر کا سوال آپ کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ ایک سوال جو بہت مؤثر تھا! برٹنڈ رسل' جو حسنِ اظہار میں بڑے سے بڑے ادیب سے زیادہ تھا' حسنِ تخیل میں بڑے سے بڑے شاعر کے برابر تھا اور اظہار میں واضح ہونے (clarity of thought) میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا اور صاف انداز میں سوچنے میں معاصر دنیا میں ایک بڑا نام تھا اور صرف فلسفیانہ حلقوں ہی میں نہیں بلکہ اور دائروں میں بھی بہت مؤثر تھا' اس نے ایک کتاب لکھی "Why I Am Not A Christian?" (''میں ایک عیسائی کیوں نہیں ہوں؟'') یہ ایک زمانے میں دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں سے ایک رہی ہے اور آج بھی اس کے پڑھنے والوں کا flow اور رواج کم نہیں ہوا ہے۔ اس کتاب میں اُس نے ایک سوال اسلام پر بھی اٹھایا ہے کہ ''اسلام نے کون سی ذہنی اور تہذیبی ضرورت پوری کی ہے؟'' مطلب یہ کہ اسلام آج کی دنیا میں کون سی علمی اور تہذیبی ضرورت پوری کر رہا ہے؟ تو اُس کے اس سوال کو دن میں دو چار مرتبہ اپنے اندر گونجنے دیجیے۔ اس معاندانہ سوال کو! اور پھر سوچیے کہ آپ اس دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں یا کیا کر سکتے ہیں؟ کیا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ رسل کو ٹھوس بنیادوں پر غلط ثابت کریں؟

اس سوال کی وضاحت کچھ اس طرح ہے:

☆ اسلام کی انسانی علم اور تہذیب کے لیے کیا contribution ہے؟

☆ اسلام نے شعور کے علمی افق کو کتنا وسیع کیا ہے اور وجود کے اخلاقی substance کو کتنا creative اور productive بنایا ہے؟

☆ انسانی تہذیب کی وہ کون سی اقدار ہیں جن کو اسلام عملی طور پر چلا رہا ہے؟

رسل یہ نہیں کہہ رہا کہ ایک ہزار سال پرانی مثالیں لا کر دیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ تمہاری اور تمہارے دین کی کامیابی کی تمام مثالیں ماضی بعید ہی میں کیوں ہیں؟ اب ظاہر ہے کہ یہ سوال شیطنت ہے' لیکن جیسے ہی ہم وہاں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ یہ سوال شیطنت ہے' ویسے ہی اپنے محضرِ شکست پر دستخط کر دیں گے۔ ہم کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں کہ یہ شیطانی سوال ہے' یہ کافرانہ سوال ہے' یہ جاہلانہ استفسار ہے۔ لیکن اس سوال کے جو اثرات پیدا ہو رہے ہیں ان اثرات کی روک تھام کا کوئی مؤثر انتظام نہیں کرتے۔ یہ سوال حامد میر جیسے میڈیا کے لوگوں کی

طرف سے اٹھایا ہوا سوال نہیں۔ یہ سوال رسل کا ہے! جس نے فلسفے کے ایک اسکول میں مرکزی حیثیت اختیار کی تھی۔ تاریخِ فلسفہ اس بات کی شاہد ہے کہ رسل ذہن کی ایک بہترین ورکنگ اور تصور سازی کی بہترین روایت کو سمجھتا ہے اور اس کی یہ سمجھ ناقدانہ ہے۔ رسل کا کہنا ہے جب میں کسی دین کو قبول کرتا ہوں تو اُس کو اپنے شعور اور زندگی کے ذرّے ذرّے کے لیے بائنڈنگ بناتا ہوں۔ یہاں رسل کی علمی حیثیت ہم نے بطور ایک ناقد اور ادیب اس لیے بیان کی کہ اُس کے سوال کی اہمیت اُجاگر ہو۔ کیونکہ اصل چیز یہ ہے کہ ایسی شخصیت کے سوالات آپ کی عمارتِ فکر کو ڈھانے والے حملوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں سوچنا یہ ہے کہ ان حملوں کی روک تھام کا کوئی نظام ہمارے پاس موجود ہے یا نہیں؟ جس علمی اعتبار سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے' عین اسی علمی تیقن کے ساتھ اس کا جواب فراہم کیا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ اگر ہم ایسے سوالات کے قابل تسلیم بلکہ واجب التسلیم جواب فراہم کرنے کے لائق نہیں ہیں' تو ہمیں بہت غور کرنا چاہیے کہ ہمارا ایمان بھی تو کہیں مصنوعی نہیں ہے؟ ہماری دینداری بھی تو کہیں ایک پردے کی حیثیت نہیں رکھتی؟ کیا ہمارا مسلمان رہنا محض ہماری ضد پر قائم ہے یا ہمارا مسلمان رہنا شعور کے ایک بہترین اور مستقل فیصلے کی حیثیت رکھتا ہے؟ یہ ہماری بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ جدید ذہن میں جگہ بنا لینے والے شبہات اور جدید دماغ میں جڑ پکڑ لینے والے الحاد کو ہم لوگ دور کر لینے کا قصد اور اہلیت رکھتے ہیں یا نہیں؟

۲) اَخلاقی چیلنجز

چیلنجز کی دوسری نوع اخلاقی ہے۔ اخلاق کہتے ہیں وجود کے مرکز کو۔ اسی طرح علم کہتے ہیں شعور کے مرکز کو۔ اسلام ہم سے شعور کے مرکز میں بٹھایا جانا طلب کرتا ہے اور وجود میں بھی مرکزی درجہ پر فعال حالت میں رہنا طلب کرتا ہے۔ اگر ان دو مطالبات کو پورا کرنے میں ہم سے کوئی بھی کوتاہی ہوئی تو گویا اسلام کو بے اثر اور بے کشش بنانے والی عالم گیر طاقتوں کا ساتھ دینے جیسا عمل ہوگا۔ اخلاقی چیلنجز وہ ہیں جو ہمارے وجود کی بناوٹ کو دینی نہیں رہنے دے رہے ہیں' وہ ہمارے وجود کو بندگی کے مادّے سے تعمیر ہونے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ علمی چیلنجز ایسے ہیں جو ہمارے شعور کو ایمانی بننے سے روک رہے ہیں۔

۳) انتظامی چیلنجز

تیسرا چیلنج ایک طرح سے انتظامی ہے' یعنی چیزوں پر ایسا خلاقی تصرف کہ چیزیں ہماری ضرورت کو پورا کرنے کے لائق ہو جائیں۔ چیزوں کی ایک ایسی عملی تنظیم کہ جسے ہم چیزوں پر وارد کر کے چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی لیاقت حاصل کریں۔ تو یہ وہ چیلنج ہے کہ جسے ہم انتظامی چیلنج کا نام دے سکتے ہیں۔ انسانی اجتماعیت آئیڈیا اور اخلاق کے ساتھ ساتھ ان آئیڈیاز کو عمل میں لانے کے لیے اور ان کو actualize کرنے کے لیے چیزوں پر ایک انتظامی گرفت کا تقاضا کرتی ہے۔ چیزوں کی درست مینجمنٹ کا تقاضا' تاکہ چیزیں اپنی اپنی طبعی حدود سے نکل کر انسان کی ضرورت کو مکمل کرنے کی قابلیت پیدا کر لیں۔ العرض یہ بھی ہمارا

مسئلہ ہے۔اس مسئلہ کے ضمن میں نظام سازی وغیرہ کے مباحث آجاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ تاریخ انسانی کے سب سے بڑے المیوں میں سے ایک المیہ یہ ہے کہ اخلاق کو مذہب سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اخلاق آدمی کی فطری جبلت (natural instinct) ہے' جب اسے مذہب کے قبضے میں دے دیا گیا تو اُس کے نتیجے میں انسان بحیثیت مجموعی ایک المیے سے دوچار ہوگیا۔ ایسی بیسیوں لرزا دینے کی حد تک خطرناک باتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ ہمیں جو چیز فوری طور پر علمی چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے سیکھنی چاہیے وہ یہ اصول ہے کہ دین کا علم بھی اُسی ذہن سے بہتر طریقہ سے حاصل ہوسکتا ہے' اور اُسی ذہنی صلاحیت کا متقاضی ہے کہ جس ذہنی صلاحیت کو کام میں لا کر کانٹ اور آئن سٹائن جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ دین کو سمجھنے کے لیے کسی علیحدہ قوت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ شعور اپنی بہترین حالت اور استدلال کے ساتھ ایمان کو قبول کرلے' یہی وہ شرطِ علم ہے جس کو ہمارے دینی تعلیمی نظام میں نمو پانے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ ایک کام جسے بہت ٹھوس شکل میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں... یہ ایک آفاقی مسلّمہ ہے کہ علم کی تشکیل کا عمل کثرت میں وحدت کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی دنیا کا تجزیہ اور انسان کی تحلیل کرنے والے جملہ علوم کا مسلّمہ یہ ہے کہ ''علم'' کا مطلب ہے کہ میں جس چیز کو جانتا ہوں اس کی اصلِ وحدت اور غایتِ قصویٰ کو جان لوں۔ یعنی اُس کی اصل کو بھی اس کی وحدت کے ساتھ سمجھ لوں' اور اُس کی غایت (یعنی اس کے انجام) کو بھی اس کی وحدت کے ساتھ جان لوں۔ یہی بات شعور کی تمام فطری صلاحیتوں (faculties) کا مسلمہ بھی ہے۔ کیونکہ کثرت سے زمین پر کھڑی ہوئی چیزیں وحدت سے وجود میں آئیں۔ وحدت شجرِ وجود کا بیج بھی ہے اور شجرِ وجود کا پھل بھی ہے۔ تو یہ مسلّمہ ہے کہ چیزیں وحدت سے پیدا ہوتی ہیں اور وحدت میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ یہ مسلمہ ہے تمام علوم کا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس مسلّمہ کو عمل میں لائے رکھنے کی اور اس مسلّمہ کی لامحدود طریقہ سے نظری تطبیق کرنے کی کیسی سہولت ہمیں اپنے ایمان اور دین کی صورت میں حاصل ہے۔ ہم اس چیز کو کتنی آسانی سے اس بات میں منتقل کر سکتے ہیں کہ چیزوں کی حقیقت بھی اللہ ہے اور کائنات کی منزل بھی اللہ ہے۔ توحید کا مطلب ہے کہ چیزیں اپنے وجود میں بھی وحدت سے منتزع (کسی چیز میں سے کھینچ کر نکالنے والا) ہیں اور اپنی انتہا پر بھی وحدت میں ڈھلنے کے لیے ہیں۔ عقیدۂ توحید ہمارے دماغ میں اگر کائنات کے بارے میں بائنڈنگ اور ڈیفائننگ علوم پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن پا رہا ہے تو اُس میں ظاہر ہے کہ بہت کچھ نقص' بہت کچھ سبب ہماری غفلت' بے بسی اور بے پرواہی کا بھی ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ دین کی تعلیم حاصل کرتے وقت' یا دین کی تعلیم رسمی طور پر مکمل ہوجانے کے بعد' اس نکتہ پر اپنے جہانِ شعور کی تعمیر کرتے ہیں کہ ایمان بالغیب کا راست نتیجہ یہ ہے کہ ایمان بالغیب گویا مجھے اس قابل بناتا ہے کہ میں دنیائے حاضر اور کائناتِ شہود کی حقیقت تک رسائی حاصل کرلوں۔ تو اتنی بڑی سہولت موجود ہوتے ہوئے اور اتنے بڑے مسلمات کو گویا تصدیق فراہم کرنے والے عقیدۂ توحید کا حامل ہوتے ہوئے بھی اگر میرا ایمانی شعور چیزوں کو اُن کی حقیقت سے جڑا رکھنے میں ناکام چلا آرہا ہے تو اس کا مطلب ظاہر ہے' یہ ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں' ہماری دینی تعلیم کے نصاب میں' کسی ایسے عنصر کی کمی رہ گئی ہے جو دینی علم کو اُس کے اپنے بنائے ہوئے مزاج اور اَہداف سے منقطع کر کے حاصل کیے چلا جارہا ہے۔ مطلب یہ کہ

اگر توحید چیزوں کو دیکھنے کا واحد علمی روزن نہیں بن پائی' اگر میرا عقیدۂ توحید میرے اور دنیا' اور میرے اور میرے نفس کے درمیان' واحد پل بن کر کام نہیں کر رہا تو اس کا مطلب ہے کہ میرے لیے یہ عقیدہ محض حافظے کے سل پر لکھی ہوئی عبارت ہے' جسے میں ہٹ دھرمی اور بے دلی سے محفوظ رکھے ہوئے ہوں۔ اس کے علاہ اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر ہم اپنے نظامِ تعلیم کی بنیاد اس اصول پر اور اس ذمہ داری پر رکھ دیں کہ دین اپنے معلوم ہونے کے ہر ہر مرحلے پر بہترین شعور کی پرورش اور تکمیل کرتا ہے... اس شعور کی تکمیل جو دنیا کے علم کے لیے بھی درکار ہے... اگر ہم اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر' اس مقصد کو حاضر کر کے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دینی تعلیمی کا کوئی میتھڈ' کوئی روش' کوئی روایت اپناتے ہیں تو وہ' ان شاء اللہ' ہمارے مزاجِ ایمانی سے مناسبت رکھنے والی ہوگی۔ ہمارے اندر اُس صلاحیت کو ترویج دینے کا واحد وسیلہ بنے گی جس صلاحیت کی موجودگی کے بغیر ہم اپنے دین پر اثر انداز ہونے والے' اپنے دین کو مجروح کر دینے والے علمی اختلافات کا سامنا نہ کر سکیں گے۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں دینی تعلیم کا پورا نظام اور نصابِ تعلیم اس اسلوب' اصول اور اعظم المقاصد پر استوار کر کے دکھاؤں۔ پس سب سے پہلے اپنے شعور کو وسعت دو' اپنے شعور کو گہرائی دو' اپنے شعور کو خلاقی وجود کے ساتھ فعال بناؤ... ایمان کے جوہر پر۔ افسوس یہ کہ ہماری جو موجودہ صورت حال ہے اس میں ہمارا ایمان شعور کی اخلاقی بنیاد نہیں بن رہا ہے' ہمارا ایمان شعور میں عقیدے کی مدافعت کرنے والی بہترین صلاحیتوں کی پرورش نہیں کر رہا ہے۔ اس پر دھیان دینا چاہیے' اس کے بغیر ہم اپنی روایت' اپنے دین کو پیش آنے والے کسی بھی چیلنج کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اگلی مرتبہ اللہ نے چاہا تو داخلی اور خارجی چیلنجز پر گفتگو ہوگی' اور اس پر کہ ان سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

اصلاحِ معاشرہ کی تعبیر

(مولانا علی میاںؒ کے افکار کی روشنی میں)

ڈاکٹر حافظ فدا حسین ☆

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۹۹ء) کا تعلق بریلی (انڈیا) کے سادات خاندان سے تھا اور آپ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ عالمگیر شہرت کی شخصیت کے حامل تھے۔ وسیع العلم اور کثیر التصانیف تھے۔ آپ کی کتابوں کو عرب و عجم نے پڑھا اور ان سے استفادہ کیا۔ سادگی، زہد و استغنا عن الخلق، تعلق مع اللہ، تواضع و انکساری اور استحکامِ ملت کے لیے تڑپ اور بے قراری ان کے امتیازی اوصاف ہیں۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ بے نظیر کتاب ''نُزھۃ الخواطر'' کے مصنف ہیں۔ عبداللہ الاشتر مولانا علی میاں کے پہلے جد امجد تھے جنہوں نے اپنے خون سے سندھ کی سرزمین کو سیراب کیا۔ ان کے دوسرے جد امجد سید احمد شہید (م ۱۸۳۱ء) سکھوں سے لڑتے ہوئے بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

مولانا علی میاںؒ عالمِ اسلام کی صاحبِ علم و سیرت اور صاحبِ بصیرت شخصیت تھے۔ آپ بنیادی طور پر عالم و معلم، اردو، عربی کے صاحبِ طرز انشا پرداز، ممتاز و منفرد مؤرخ، سیرت نگار، ایک روشن ضمیر صوفی و بزرگ اور سب سے بڑھ کر اسلام کے بین الاقوامی داعی اور ترجمان تھے۔ ذمہ دار شہری اور دردمند انسان تھے۔ تحریک پیام انسانیت کے ذریعے ان کی تحریر و تقریر کا بنیادی موضوع انسانیت کی اصلاح، تعمیر انسانیت اور ایک بہتر معاشرے اور سماج کی تشکیل رہا۔ ان کی تمام تصانیف، خواہ ان کا تعلق براہِ راست انسان اور انسانیت سے تھا یا تاریخ، تفسیر، مذہب یا تمدن سے، بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے شذراتِ فکر کے نمونے ہر تصنیف، تحریر اور تقریر میں موجود رہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف —— مثلاً تحفہ انسانیت، پیامِ انسانیت، مذہب و تمدن، مقامِ انسانیت، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، محسن عالم ﷺ، دنیا میں آنے والے انسانی چمن کے پھول یا کانٹے، نبی رحمت ﷺ، تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات، انسانیت کے محسن اعظم ﷺ، ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کا حصہ، انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار، انسانیت کی رہنمائی میں اسلام کا عظیم کردار، وغیرہ —— میں اپنی زندگی کے عمیق مشاہدوں، لامحدود تجربوں، علمی فتوحات، فکری گہرائیوں اور تاریخی سچائیوں کو شستہ اور دلنشیں پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے۔ مولانا اپنی اعلیٰ تنقیدی بصیرت، علمی وسعت، فکری گہرائی و گیرائی اور منطقی استدلال کے ذریعے اپنے قارئین اور سامعین کو اپنا گرویدہ بنا لینے کا ہنر

☆ ڈپٹی کنٹرولر (سیکریسی) ثانوی و اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ، ملتان

جانتے تھے۔اس پر ان کا دلآویز اور شگفتہ اسلوبِ بیان گفتگو اور تحریر میں دلکشی پیدا کر کے دلچسپی کا سامان بھی فراہم کر دیتا ہے۔ان میں اپنے موقف کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کی خداداد صلاحیت بھی موجود تھی۔دوسرے لفظوں میں ان کی تحریر اور تقریر ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق تھی۔علم و قلم کے ذریعے باطل شکن تلواروں کو ڈھالنے کا سلیقہ سکھانے والے تھے۔مولانا عالم اسلام کی سیاسی' معاشی اور مذہبی صورت حال پر گہری نظر رکھتے تھے' بالخصوص برعظیم پاک و ہند کے سیاسی' تہذیبی' معاشی اور مذہبی مسائل پر انہوں نے اپنے مختلف مقالات اور تصانیف میں جس دقتِ نظری اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت فراہم کیا ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

معاشرہ وہ شاخ ہے جس سے انسانیت کی زندگی وابستہ ہوتی ہے' اس لیے جس شاخ پر ہمیں نشیمن بنانا ہے اس شاخ کی فکر اور حفاظت کی ذمہ داری ہماری اولین ضرورت ہے۔اگر شاخ نہیں رہے گی تو پھر نشیمن کے وجود کا سوال ہی بے کار ہے۔معاصر اسلامی دنیا میں کوئی ملک یا معاشرہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں اسلامی زندگی کی بھرپور عکاسی پائی جاتی ہو۔

اس وقت دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت ملکی سطح پر ایسے صحیح اسلامی و فلاحی معاشرہ کا قیام ہے جس کے وجود کو محسوس کیا جا سکے' اس لیے کہ صالح' پاکیزہ اور طاقت ور معاشرہ اقتدار اور تہذیب کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ ہے اور وہ اپنے افراد کے حقوق کا لحاظ رکھتا ہے۔اس کے مقابلہ میں حکومت اور اقتدار کی حیثیت ثانوی ہے۔اگر معاشرہ صالح' ایماندار' عزتوں کے محافظ اور ذمہ دار افراد پیدا کر رہا ہے تو پھر ان حالات میں حکومتوں کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ صالح معاشرہ وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ دار حکومتیں عطا کرتا رہے گا۔مثلاً ہندوستان میں محمود غزنوی کے حملے کے بعد شہاب الدین محمد غوری اور قطب الدین ایبک نے اسلامی سلطنت کو مضبوط کیا جس کے نتیجے میں پورا ہندوستان مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ان کے بعد ہندوستان میں کئی خاندانوں کی حکومتیں بنتی رہیں لیکن اسلامی حکومت میں صالح اور صحت مند معاشرے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا۔(۱)

صالح اور صحت مند معاشرہ کے افراد اخلاقِ حسنہ کی ضرورت اور اہمیت کے قائل بھی ہوتے ہیں اور حامل بھی۔انہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتا' ناپ تول میں کمی نہیں کرتا' دھوکہ نہیں دیتا' زر کا پرستار نہیں ہوتا ہے' وقتی منافع کے لیے دائمی منافع کو قربان نہیں کرتا' اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا' ظلم نہیں کرتا' دھوکہ نہیں دیتا۔مسلمان کو بڑی سے بڑی سیم و زر کی تھیلی اور بڑی سے بڑی پیشکش خرید نہیں سکتی' وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتا' جس بات کو حق سمجھتا ہے اس پر اپنا گھر لٹا سکتا ہے' سر کٹا سکتا ہے' اس پر اپنے خاندان کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے' اپنے پیٹ پر پتھر باندھ سکتا ہے' فاقہ کر کے مر سکتا ہے' لیکن کفر و ضلالت اور ظلم و ستم کا راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔(۲)

لہٰذا ایسا صالح اور ظلم سے پاک معاشرہ قائم کیا جائے جس پر تمدن سوار نہ ہو بلکہ اس معاشرہ نے تمدن کو اپنے زانو کے نیچے رکھا ہو۔اس نے زندگی کی آسائشوں کو اپنا تابع بنا رکھا ہو' وہ کسی شرعی حد سے تجاوز نہ کرتا ہو' وہاں رشوت کا وجود نہ ہو اور اس کے کسی جج کو طاقت یا دولت سے غلط فیصلہ کرنے پر آمادہ نہ کیا جا سکتا ہو۔وہاں اگر کسی کمزور سے کمزور پر ظلم ہو تو وہ طاقتور سے طاقتور آدمی بن جاتا ہو۔اس حوالہ سے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ ﴾ (ھود)

''جو نسلیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں' ان میں ایسے صاحب شعور کیوں نہ ہوئے جو ملک میں بگاڑ پھیلنے سے روکتے؟ ہاں ایسے تھوڑے سے تھے جن کو ہم نے ان میں سے بچالیا' اور جو ظالم تھے وہ عیش و آرام کے انہی اسباب کے چکر میں پڑے رہے جو ان کے لیے مہیا کیے گئے تھے اور وہ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔''

جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''تم میں بڑے سے بڑا قوی میرے نزدیک کمزور ہے اگر وہ ظلم کرے گا' اور تم میں سب سے زیادہ کمزور طاقتور ہے اگر اس پر ظلم ہو''۔ مطلوبہ صالح معاشرہ کے قیام کے لیے درج بالا قرآنی آیت پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

مولانا کے خیال میں مذکورہ صفات کا حامل معاشرہ ہی آئیڈیل اور صالح معاشرہ کہلانے کا حق دار ہے اور اسی معاشرے کی راہ دنیا دیکھ رہی ہے۔ عصر حاضر میں اگر انسانیت کی کوئی خدمت ہوسکتی ہے تو وہ ایک آزاد' طاقتور اور صالح معاشرہ کا قیام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جاہ طلبی' حصولِ اقتدار کی چاہت اور شخصی مفادات سے اجتناب کیا جائے' کیونکہ یہ چیزیں معاشروں اور قوموں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانے میں اسلامی مملکت کو جو کچھ نقصان پہنچا وہ ہماری دورنگی / تضاد عملی اور مفاد پرستوں سے پہنچا ہے۔ ہلاکو خان کو بغداد پر حملہ کی دعوت کس نے دی اور خود اس کا کیا انجام ہوا؟ حکومت عباسیہ کے زوال کا سبب اپنے ہی بااثر اور صاحب اختیار' خلیفہ مستعصم کے زیر وزبر ابن علقمی اور ان کے رفیق نصیرالدین طوسی تھے جو مارِ آستین اور خنجر در بغل ثابت ہوئے۔ لیکن تاتاریوں نے خود ابن علقمی کو بھی یہ کہہ کر قتل کر دیا کہ جو اپنوں کا وفادار نہیں ہوا تو ہمارا وفادار کس طرح ہوسکتا ہے؟ آپ ہندوستان کی تاریخ پڑھیں گے تو میر جعفر اور میر صادق کے نام سامنے آئیں گے' جن کے متعلق اقبال نے کہا ہے ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم' ننگِ دیں' ننگِ وطن!

مذہبی اختلافات کو ہوا دے کر' گروہی پروپیگنڈا کر کے' ملک میں اعتقادی یا سیاسی انتشار پیدا کر کے اور مال و دولت اور منصب کے ذریعے اپنا گرویدہ بنا کر جعفر و صادق اس زمانہ میں بھی سامنے آسکتے ہیں۔ آج پوری دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ کوئی ایسا معاشرہ تیار ہو جائے جس کی طرف انگلی اُٹھا کر ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکیں کہ اسلام کو دیکھنا ہو تو اس معاشرہ کو دیکھ لو۔ (۳)

مولانا علی میاںؒ نے عالمِ اسلام کے معاشرہ کی بابت اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان معاشروں میں مفاد پرستی کے ساتھ ساتھ مادیت کا غلبہ اور دولت کی فراوانی دیکھ رہے ہیں جس کی وجہ سے زندگی کا معیار تیزی سے بلند ہو رہا ہے۔ دولت کی فراوانی سے لوگوں کے اخلاق بدل جاتے ہیں اور دولت مند افراد ہی کو' چاہے جتنے ہی برے کیوں نہ ہوں' قابل عزت شخصیت تصور کیا جاتا ہے۔ دولت کا عزیز و اقارب' والدین' بہن بھائی' اولاد' ہمسائے اور معاشرہ کے دیگر افراد کے ساتھ تعلقات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ لوگ معیارِ زندگی کے بلند ہونے کی وجہ سے اپنی عادتوں کے غلام بن گئے ہیں۔ جبکہ

دوسری طرف اہل عرب میں اسلامی فتوحات کا اصل راز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قوتِ ایمانی تھی جس کو دنیا بھر نے تسلیم کیا۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی بہت سادہ تھی' وہ اپنی عادتوں کے غلام نہیں تھے اور انہوں نے بھوکا رہنا سیکھا ہوا تھا۔ لہٰذا عادات کی غلامی سے نجات حاصل کرنا ناگزیر ہے جس کے لیے دولت کے حصول میں مسابقت کے جذبے اور دوڑ سے اجتناب کرنا ہوگا اور یہی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ (۴)

عالمِ اسلام کی معاشرتی شکست وریخت کے عوامل

اندلس کی تاریخ میں مدینة الزهراء اور قلعة الحمراء کی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کیجیے۔ وہ سب کچھ' خواب وخیال اور جن و پری کی باتیں معلوم ہوں گی۔ اندلس کی سرزمین میں دو بڑے عنصر اسلام کے زوال کا باعث ہوئے ہیں۔ ایک معیاری زندگی کی بلندی اور اللہ کی دی ہوئی دولت کا غلط استعمال اور دوسرے یہ کہ اشاعت اسلام اور معاشرے کو اسلامی بنانے کے بجائے انہوں نے فنونِ لطیفہ' شعروشاعری اور ادبیات وغیرہ پر ساری توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔ دولت کا بے جا خرچ' اپنی عظمت یا اہمیت کا اظہار' معیارِ زندگی کی روز افزوں ترقی' ضروریات کی فہرست میں مسلسل اضافہ اور ان کو ضروری وشرطِ زندگی سمجھ لینا' یہی وہ خرابیاں ہیں جنہوں نے ایرانی ورومی تمدن کو عذابِ جاں بنا دیا تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ زیادہ تر قوموں کا زوال ان کے تمدن کی خرابی سے ہوا ہے۔ مولانا نے عالم اسلام کی معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا بلکہ غیر جذباتی اور منطقی استدلال کے ساتھ اس کا خوبصورت تجزیہ بھی کیا۔ انہوں نے عالم عربی/عالم اسلام کی معاشرتی زندگی کو شکست و ریخت سے دوچار کرنے والے درج ذیل تین عوامل کی نشاندہی کی ہے:

(۱) فروعی مذہبی اختلافات (۲) مختلف النوع تعصّبات (۳) جماعتی گروہ بندیوں میں غلو

یہ وہ عوامل ہیں جن سے معاشرے کے اندر عدم استحکام پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ سے اخوت' بھائی چارہ' ہمدردی' حسن سلوک اور اخلاقِ حمیدہ ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نتیجتاً معاشرتی زندگی شکست وریخت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ذیل میں ان عوامل پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے:

(۱) فروعی مذہبی اختلافات: مولانا علی میاں کے مطابق عالم اسلام میں مذہبی فروعی بحثیں بہت زیادہ جنم لے رہی ہیں۔ اگرچہ یہ اختلافات ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن جب فروعی اختلافات علماء اور اہل علم سے نکل کر عوام میں آجائیں تو یہ بحثیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ مختلف اختلافی مباحث ومسائل علماء تک محدود ہونے کی چیز ہے' کوچہ اور بازار کی نہیں۔ جب فروعی اختلافات عوامی شاہراہوں پر گھومنے پھرنے لگیں تو اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ معاشرہ افتراق کا شکار ہو کر شکست وریخت کی کیفیت سے دوچار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور نتیجتاً امت کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ لہٰذا معاشرتی استحکام کے لیے اختلافی مسائل کو بالائے طاق رکھنا بہت ضروری ہے۔ (۵)

کسی بھی معاشرہ کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ عصر حاضر کے علماء اور دانشور طبقہ اپنے اندر مطلوبہ صفات پیدا کرے۔ اس حوالے سے مولانا علی میاںؒ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے: ''اَیُنْقَصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیّ'' ابوبکر زندہ ہو اور پھر اللہ اور رسول اللہ کے دین میں کوئی قطع وبرید ہو جائے؟ یعنی

میرے جیتے جی دین میں کمی ممکن نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:

''میں ایک تجربہ کار سیاح اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر سب سے بڑا تاریخ ساز' انقلاب انگیز' عہد آفرین جملہ جس نے ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی' ذہنوں میں انقلاب برپا کیا' ہزاروں مصلحین' مفکّرین' فلاسفر اور عظیم ترین انسان پیدا کیے' پوری ادبیات عالم میں اور ادیان و مذاہب کی تاریخ میں اور معاشرہ پر اثر ڈالنے والے جملوں کی فہرست میں کسی نے اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے جملے أینقص الدین و انا حیّ (میرے جیتے جی دین میں کمی ہو؟) نے اعتقادی' ذہنی' فکری اور عملی اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ڈالا۔ یہی وہ کلمہ ہے جو دل کی ترجمانی کرنے والا اور لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ اللہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دین کی بقا و حفاظت کے لیے پیدا فرمایا تھا' اگر آپؓ عزیمت اور استقامت سے کام نہ لیتے تو دین اسلام کی بقا خطرہ میں تھی۔ آج منکرین زکوٰۃ نے اسلام کے ایک رکن پر حملہ کیا تھا' کل آہستہ آہستہ دوسرے ارکانِ اسلام پر حملہ کیا جاتا۔ دیگر مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب ترمیم و تحریف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہیں رکتا۔ یقیناً صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ قیمتی اور وزنی فقرہ شاعروں کے دیوان اور اسلامی ادبیات میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔'' (۶)

لہٰذا علماء کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنا احتساب کرتے ہوئے یہ دیکھیں کہ انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ قول کو کہاں تک اپنا اصول اور دستور العمل بنایا ہے' نیز ان کے ہوتے ہوئے اسلامی معاشرہ کے زوال کا کوئی جواز ہے؟ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ماضی میں جن ممالک میں اسلام دشمن طاقتیں غالب آئیں ان میں دو چیزیں بہت بنیادی تھیں' پہلی چیز علماء کا باہمی اختلاف اور دوسری چیز یہ تھی کہ علماء کا عوام سے رابطہ نہیں تھا۔ ان کی شخصیتیں اتنی مؤثر نہیں تھیں کہ عوام کے قلوب میں دین کا احترام اور علماء کا وقار رکھتیں۔ (۷)

مولانا نے علماء و دانشوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عصرِ حاضر میں بھی ہم اسی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں جس کی بابت مولانا کی صورت میں ایک زمانہ شناس اور دور اندیش مفکّر نے بہت پہلے خبردار کر دیا تھا۔ مولانا علی میاں علماء کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ درس کے حلقوں اور علمی مجالس میں اختلافی مسائل پر آزادی سے گفتگو کریں اور اس پر تحریری کام بھی کریں لیکن اس کی آڑ میں کسی بھی صورت ملک اور ملکی سالمیت کو داؤ پر نہ لگائیں۔ بصورتِ دیگر جس میں احساسِ برتری پیدا ہوگا اس کے مقابل دوسرا محاذ بن جائے گا اور وہاں سے صدائے ''ہم چوں من دیگرے نیست'' بلند ہونے لگے گی۔ اس لیے عوامی مجالس اور حلقوں میں فروعی مذہبی اختلافات سے گریز کیا جائے بلکہ ان حلقوں میں باہمی اخوت و محبت' بھائی چارہ اور اتحاد کو فروغ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ندویؒ نے پوری زندگی اپنی توجہ کا مرکز و محور تعمیر انسانیت کو بنایا اور تاحیات ''اتّحاد بین المسلمین'' کے داعی رہے' کیونکہ ان کے نزدیک انسان کی تخلیق تعمیر انسانیت اور اتحادِ اُمت کے لیے ہوئی ہے۔ حضرت مجدّد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہما اللہ کے مکاتیب پڑھیے۔ ہندوستان کے اس دور میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی' احمد شاہ ابدالی کو شاہ ولی اللہ نے ایک مفصل خط لکھا جس میں انہیں بتایا کہ مسلمان اس وقت کس بے بسی کی حالت میں ہیں۔ موجودہ خطروں اور اندیشوں میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ علماء آپس میں دست و گریباں ہوں۔ نتیجتاً عوام آلۂ کار بن جائیں گے اور پورا ملک میدانِ جنگ

بن جائے گا۔علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟ فقیہہ وصوفی وشاعر کی ناخوش اندیشی!(۸)

الغرض علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام میں اپنے رابطے کو بڑھاتے ہوئے انہیں ہمہ قسم تعصّبات ومذہبی فروعی اختلافات سے دُور رکھیں اور اپنی زندگی میں سیرت کی بلندی' زہد واستغنا' روحانیت اور اخلاقِ عالیہ پیدا کریں اور ''پدرم سلطان بود'' کی گردان کو ترک کردیں۔اختلافی مسائل میں تسامح اور متفق علیہ مسائل میں توافق سے کام لیں۔اسی طرح معاشرہ کے افراد کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مذہبی فروعی اختلافات سے اجتناب کریں اور ان اختلافات کو علماء کے لیے چھوڑ دیں۔

(۲) مختلف النوع تعصّبات: مولانا کے خیال میں معاشرے کے استحکام کو شکست وریخت سے دوچار کرنے والا دوسرا عنصر عصبیت ہے' خواہ یہ عصبیت لسانی' نسلی' خاندانی' صوبائی ہو یا علاقائی' کیونکہ کوئی بھی معاشرہ مختلف عصبیتوں کی موجودگی میں مستحکم نہیں رہ سکتا۔ان کے نزدیک اسلام اربابِ دنیا کے چھوٹے چھوٹے مقاصد سے جنم لینے والی چھوٹی چھوٹی وحدتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔اس کی دلچسپی صرف اور صرف دو حقیقی وحدتوں سے ہے اور یہ دونوں وحدتیں دنیا کی بے ضرر ترین وحدتیں ہیں۔ان میں ایک وحدتِ انسانیت اور دوسری وحدتِ ایمان ہے۔ان دونوں وحدتوں کی موجودگی میں چھوٹی چھوٹی تمام وحدتیں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ عصبیتیں دوسرے ممالک میں بھی پائی جاتی ہیں' لیکن ان عصبیتوں کی عالم عربی/عالم اسلام میں موجودگی خیر کی علامت نہیں' کیونکہ ان عصبیتوں کی موجودگی میں دیگر ممالک ان سے فائدہ اٹھانے اور اپنے اغراض کا آلۂ کار بنانے کے لیے عوام کو استعمال کرسکتے ہیں۔اگر کسی معاشرے میں زبان یا علاقائی فخر اور احساسِ برتری کا بھوت کسی صوبے یا علاقے پر سوار ہوجائے اور پوری قوم اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجائے تو ایسی صورت میں بیرونی دنیا کے لوگوں کو جو پیغام جائے گا اس سے بیرونی مبصروں اور سیاحوں کو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

مولانا علی میاںؒ نے اس بات کی وضاحت کے لیے مکہ اور مدینہ کی خوبصورت مثال پیش کی ہے۔مکہ اور مدینہ دو مختلف تمدنوں کے حامل علاقوں کے نام ہیں' جن کی بنیاد تہذیب یا معاشرہ کی وحدت پر نہیں تھی بلکہ زبان کی وحدت تھی' مگر اس میں بھی لہجوں کا اتنا فرق تھا جو ایک کو دوسرے سے دور رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔اور پھر اہل مدینہ کے مقابلے میں اہل مکہ کا احساسِ برتری اور خود مدینہ میں اوس وخزرج قبائل کا دو الگ قوموں کی طرح معرکہ آرا ہونا' یہ تمام اختلاف اسلام کے اس تصورِ وحدت نے مٹادیے جو بقول مولانا علی میاں اپنے اندر مقناطیسیت رکھتا ہے۔

صوبائی اور لسانی تعصب جب کسی پر سوار ہوجائے اور پوری قوم کو اس پر قربان کردینے کا جذبہ پیدا ہوجائے تو یہ حقیقی خطرات کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور معاشرے میں لسانی' تہذیبی اور علاقائی جھگڑوں کے احیاء کا فتنہ سر اُٹھاتا ہے۔لہٰذا معاشرتی اور ملکی استحکام کے لیے ناگزیر ہے کہ لسانی' صوبائی' نسلی اور تہذیبی عصبیت سے اجتناب کیا جائے۔اسی لیے شیخ ندوی نے عالمِ عرب/عالمِ اسلام میں وطنیت اور قومیت کا نعرہ لگانے والوں اور تعصب پرستی کو ہوا دینے والوں پر کڑی تنقید کی ہے۔(۹)

قرآن کریم میں اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (الحجرٰت)

''اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں، اور اپنے (مؤمن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) گناہ ہے، اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔''

لہٰذا انفرادی اور وقتی مسائل میں اُلجھنے سے اجتناب کیا جائے اور ہر شخص کی عزتِ نفس کا خیال کیا جائے۔ (۱۰)

(۳) جماعتی گروہ بندیوں میں غلو: مولانا علی میاں تیسرا خطرہ سیاسی پارٹیوں کے خودغرضانہ کردار کو سمجھتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں میں موجود خودغرض اور مفاد پرست طبقہ ملک کے وسیع تر مفادات کو پس پشت ڈال کر ذاتی خواہشات اور پارٹی کے مفادات کو اہمیت دیتا ہے اور اپنی مخالف حکومت کی جا و بے جا مخالفت کرتے ہوئے ریاست کو نقصان پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ ان کے مطابق خودغرضی اور نفس پرستی ایک چراغ سحری ہے جس کا تیل ختم ہو چکا ہے۔ خودغرضی اور انانیت، شخصی ہو یا خاندانی، جماعتی ہو یا طبقاتی، قوموں کی زندگی کے لیے ایک غیر طبعی چیز ہے، جس سے اس کو پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ مولانا کی ہمدردی اور محبت وتعاون ہر گروہ سے تھا۔ کسی ایک گروہ سے باضابطہ ایسا تعلق نہیں تھا کہ دوسروں کو وہ غیر سمجھنے لگ گئے ہوں۔ عمر بھر ان کا یہی طریقہ رہا اور اسی پر کاربند رہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طبقے میں مقبولیت عطا فرمائی۔ مولانا کسی بھی ملک میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کے مخالف نہیں۔ وہ سیاسی پارٹیوں کے سیاسی شعور اور کردار کے معترف ہیں، کیونکہ یہ پارٹیاں کسی فردِ واحد یا کسی بھی مفاد پرست ٹولے کو من مانی کرنے سے روکتی ہیں، لیکن جب یہ پارٹیاں اپنے ذاتی مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے ملکی معاملات پر اظہارِ خیال کرتی ہیں یا کوئی قدم اٹھاتی ہیں تو ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے نقصان صرف مخالف پارٹی ہی کو نہیں اٹھانا پڑتا بلکہ بسا اوقات ریاست کو بھی اس کی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔

مولانا علی میاںؒ نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا تھا کہ ''اب اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کے صبر وتحمل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں کہ کوئی دوسرا ملک اسپین بنے''۔ اس وقت ملت اسلامیہ اسپین اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد کسی بھی حادثے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے ماحول کو درست نہیں کیا۔ نیز جو خرابیاں اور خطرات اُس وقت اسپین میں تھے وہی آج عالمِ عرب / عالمِ اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں قبائلی عصبیت نے گل کھلائے جس کے نتیجے میں عیسائیت کا جو خطرہ ان پر تلوار کی طرح سر پر لٹک رہا تھا، وہ اس کو بھول گئے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کا تفوق ظاہر کرنے یا زیادہ سے زیادہ حکومت سے لینے یا اپنے قبیلے کے مفاد کی حفاظت میں لگ گئے۔ آج عالمِ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے،

کیونکہ کسی بھی ملک کے استحکام کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہوتی ہے' اس کے مقابلے میں دیگر تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ عالم اسلام کو کسی بھی انتشار سے بچانے کے لیے اصلاحِ معاشرہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے معاشرہ کو گروہ بندیوں کے انتشار سے ہر صورت میں محفوظ رکھا جائے۔ عالم اسلام کے استحکام' وحدت اور اس کی سالمیت کو ہر قیمت پر یقینی بنایا جائے۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ کس جماعت کو کریڈٹ ملتا ہے۔ اس کی فکر ہونی چاہیے کہ سر سلامت رہے' اس پر عزت کا تاج کس ہاتھ سے رکھا جائے' مفادِ عامہ کو نظر انداز کر کے جماعتی سطح پر کام نہ کیا جائے۔ رضائے الٰہی' حکمت دینی' وقت کے تقاضے اور دنیا کے ماحول کو پیش نظر خطرات کو سامنے رکھ کر اخلاص وایثار سے کام کیا جائے اور صرف اللہ سے اجر کے طالب اور امیدوار' اور **قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ** (اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے اور حق وانصاف کی گواہی دینے والے) بن کر کام کریں لہٰذا ملت کے مفاد کو ذاتی' جماعتی اور برادریوں کے مفاد پر ہمیشہ مقدم رکھا جائے' کیونکہ جماعتیں ملت کے لیے ہیں نہ کہ ملت جماعتوں کے لیے۔ (۱۱) آج صورت حال یہ ہے کہ ہماری نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور ہم کسی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے معاشرے میں معیاری اسلامی زندگی پائی جاتی ہے اور یہ وہ معاشرہ ہے جہاں چوری' دھوکہ' اور فسق وفجور نہیں ہوتا۔ یہ معاشرہ دولت اور دُنیوی کامیابی ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتا۔ (۱۲)

خیر القرون کا عصرِ حاضر سے تقابل

شیخ ندویؒ اسلام کے ابتدائی دور کی معاشرتی زندگی کا عصرِ حاضر سے تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج بھی لوگ تراشیدہ اور ناتراشیدہ بتوں کے سامنے سربسجود ہیں' آج بھی الٰہ واحد کی بندگی اجنبی ونامانوس ہو رہی ہے' آج بھی غیر اللہ کی عبادت وطاقت کا بازار گرم ہے' آج بھی خواہشاتِ نفس کا بت برسرِ راہ پوجا جا رہا ہے۔ آج بھی اَحبار ورہبان (عالم ودرویش) ملوک وسلاطین' صاحب طاقت اور اہلِ دولت' زعما وقائدین' سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر' ارباب من دون اللہ بنے ہوئے ہیں' جن کے لیے ویسی ہی قربانیاں پیش کی جا رہی ہیں اور ان کے آستانوں پر اسی طرح سے ناصیہ فرسائی ہو رہی ہے' جیسے معبودانِ باطل کے سامنے ہوتی تھی۔ آج عالمِ انسانیت اپنی وسعت' وسائل سفر کی فراوانی' نقل وحرکت کی آسانی' اور اقوام وممالک کے قرب واتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے۔ اس وقت کا مادہ پرست انسان دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے فوائد' خواہشاتِ نفس اور خود پرستی کے سوا اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ خودغرضی نے اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں دو آدمی بھی زندہ رہ سکیں۔ تنگ نظر وطن پرستی ہر ایسے انسان کو جو اس کے وطن کے باہر پیدا ہو جانے کا قصوروار ہے' نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے' اس کے ہر کمال کی منکر ہے اور اس کو ہر حق سے محروم کرتی ہے۔

صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک دو برس کے قلیل عرصہ میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے وہ اکیس برس کے اندر کیوں نہیں ہوئے؟ اس لیے کہ اس عرصہ میں کفارِ مکہ کو مدینہ طیبہ کے مہاجر مسلمان بھائیوں سے ملنے جلنے کی آزادی تھی۔ اس دوران انہوں نے مسلمانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا اور اس کے نتیجے میں ایمان ان کے دل میں اُترتا جاتا تھا کیونکہ ان کی زندگی میں عملی طور پر انقلاب آچکا تھا اور وہ مشاہدہ کر چکے تھے کہ مدینہ طیبہ کے

مسلمان فرشتوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں ۔مہمان کو کھانا کھلانے کے لیے اپنے بچوں کو بھوکا رکھتے ہیں' مہمانوں کواطمینان دلانے کے لیے پھونک مار کر چراغ بجھا دیتے ہیں اوراپنے بچوں کے سامنے سے روٹی اُٹھا کر ان پردیسی مسافروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں جن سے ان کے دین کا اختلاف ہے۔(۱۳)

یہ انسانی معاشرہ ایک بے خار گلدستہ بن گیا تھا جس کا ہر پھول اور ہر پتی اس کے لیے باعث زینت تھی اور نوع انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے تھے۔سوائے تقویٰ کے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہ تھی' کیونکہ حضور ﷺ نے ہمہ قسم جتھہ بندی کے نعروں کو ممنوع اور جاہلی حمیت کو بھی ناجائز قرار دیا۔حضور ﷺ کے قائم کردہ اسلامی وفلاحی معاشرے میں مختلف طبقے شیر وشکر ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے۔یہ انقلاب ان میں کیونکر پیدا ہوا ؟ یہ سب اسلام کا کرشمہ ہے۔مولانا علی میاںؒ عالم اسلام کو جھنجھوڑتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر آپ کے اندر بھی دولت کی لائی ہوساری خرابیاں موجود ہیں' آپ کے اندر بھی حق کے خلاف کہنے اور چلنے کی صلاحیت موجود ہے' آپ بھی عقیدہ پر پیسے کو ترجیح دیتے ہیں' آپ پیسے کو صداقت پر ترجیح دیتے ہیں' آپ پیسے کو انصاف پر ترجیح دیتے ہیں' آپ کے اندر بھی وہی نسلی' خاندانی' صوبائی اور لسانی تعصب ہے جو دیگر ممالک کی مختلف قوموں' نسلوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں میں پایا جاتا ہے تو دنیا کی کوئی قوم اور کوئی ملک بھی آپ کو خرید کر اپنے اغراض کے لیے آلہ کار بنا سکتا ہے۔ان حالات میں ہم اسلام کی نمائندگی کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ہم دنیا کے دیگر ممالک سے آنے والے ان سیاحوں' مؤرخوں اور مبصروں کو مایوس کریں گے۔وہ آکر دیکھیں گے کہ یہاں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو کسی غیر اسلامی ملک میں ہوتا ہے' بلکہ بعض ترقی یافتہ اور آزاد ملکوں کا سیاسی شعور اور شہری احساسِ ذمہ داری جو بہت سی پستیوں' بہت سی بدعنوانیوں سے ان کو روکتا ہے' یہاں وہ بھی نہیں ہے۔یہ معیاری زندگی اور آئیڈیل معاشرہ جب تک آپ دنیا کے سامنے پیش نہ کریں تبدیلی نہیں لا سکتے۔(۱۴) لہٰذا ہمیں مولانا کی مذکورہ تحریروں سے یہ درس ملتا ہے کہ اُمت مسلمہ میں اگرچہ نظریاتی اور عملی اختلاف ممکن ہے لیکن اس اختلاف کو اختلاف کی جگہ پر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو فرقوں اور گروہوں میں نہ بانٹا جائے۔

نئی نسل کی فکری راہنمائی میں مدارس کا کردار

مولانا کے خیال میں معاشرے کے استحکام کے لیے نوجوان نسل کے مزاج کو راہِ راست پر لانے کی ضرورت ہے' کیونکہ جب معاشروں کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو ان کے مزاج بھی بگڑ جاتے ہیں اور یہ صورت حال بڑی خطرناک ہوتی ہے۔فاسد الاخلاق معاشروں کے مقابلے میں فاسد المزاج معاشروں کا علاج زیادہ مشکل ہوتا ہے۔مزاج کی خرابی کی بہت سی صورتیں ہیں' ان میں ایک شکل اپنی جنت کو دوسرں کے ہاتھوں کی لکیروں میں تلاش کرنا بھی ہے۔جب قومیں اپنی جنت اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں تلاش کرنا سیکھ لیتی ہیں اور اپنے فکر کی صلاحیت اور صداقت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں تو پھر ان پر کامیابیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔قوموں میں یہ شعور بیدار کرنے اور اسے جِلا دینے میں سب سے بڑا محرک تعلیمی' تحقیقی اور تربیتی ادارے ہوتے ہیں۔یہ ادارے وہ مراکز ہیں جہاں کی درس گاہوں میں نئی نسل کے افکار کی صورت پذیری ہوا کرتی ہے۔یہ صورت پذیری اسی صورت میں ممکن ہے جب ان اداروں کو نیا اور تازہ خون میسر آتا رہے۔تازہ خون

سے ان کی مراد اداروں میں موجود وہ افراد ہیں جو سچی علمی تحقیق کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنا کارِ منصبی سرانجام دے رہے ہیں۔ ایسے افراد کے بغیر ان اداروں کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور مطلوبہ نتائج کا حصول بے سود ہو جاتا ہے۔ مولانا تعلیمی اداروں اور مدارس کی افسردہ فضا کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی مدرسہ کے لیے اس سے بڑھ کر قابل احتجاج اور قابل اعتراض لفظ ہی نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ایک دارالآثار یا کسی قدیم عہد کی یادگار ہے۔ میں اس کو مدرسہ کے حق میں ازالہ حیثیت عرفی کے مترادف سمجھتا ہوں۔ میں مدرسہ کو ہر مرکز سے مستحکم' طاقتور' زندگی کی صلاحیت رکھنے والا' اور حرکت و نمو سے لبریز سمجھتا ہوں۔ اس کا ایک سرا نبوت محمدی ﷺ سے ملا ہوا ہے اور دوسرا سرا اس زندگی سے۔ وہ نبوتِ محمدی ﷺ کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے' وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے۔ نہ نبوتِ محمدیؐ کا دریا پایاب ہونے والا ہے' نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے۔ نہ نبوتِ محمدیؐ کے چشمہ فیض سے بخل اور انکار ہے' نہ انسانیت کا کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار۔ ادھر سے اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ ' کی صدائے مکرر ہے تو ادھر سے ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ ' ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ '' کی فغانِ مسلسل۔ مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ' متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے؟ زندگی کے مسائل بے شمار' زندگی کے تغیرات بے شمار' زندگی کی ضرورتیں بے شمار' زندگی کے رہزن بے شمار' زندگی کی تمنائیں بے شمار' زندگی کے حوصلے بے شمار۔ مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ''مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے' اور جہاں انقلاب آفرین شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں' وہ مایوسی' افسردہ اور احساسِ کہتری کا شکار ہیں۔ آج مدارس کی تعداد میں' درس کی کتابوں کی تعداد میں' کتب خانے کے مندرجات کی تعداد میں' وظائف کی تعداد میں' بہت بڑا اضافہ ہے مگر زندگی کی نبض سست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے۔ کوئی حساس دردمند کبھی کبھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے' اور وہ اس بحر کا ہل کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے: ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ' کہ تو — کتاب خواں ہے' مگر صاحبِ کتاب نہیں!

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دعا کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے۔ آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں' لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں جو مدارس کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں' یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے' جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلہ صوت کا ہے۔''

اس مقصد کے لیے مولانا نے نوجوانوں کو اپنے اندر درج ذیل صفات پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے:

(۱) ان کا وجود دوسروں کے لیے نافع ہو۔ (۲) طبیعت میں استغناء پیدا کیا جائے۔
(۳) اپنے شعبۂ علم میں صاحب کمال بنا جائے۔ (۴) اخلاص
(۵) جذبہ قربانی (۶) جوہر ذاتی

(۷) ذاتی محنت (۸) عصر حاضر کے فتنوں کا ادراک
(۹) کیفیات باطنی کا اہتمام (۱۰) احساس کمتری سے حفاظت اور خودشناسی
(۱۱) زندگی کی رفاقت اور زمانے کے تقاضوں کی تکمیل
(۱۲) وسیع تیاریوں اور متنوع صلاحیتوں کی ضرورت
(۱۳) ملک کی زبان وادب سے رابطہ وتعلق اور اس میں کمال کی کوشش۔
(۱۴) عربی زبان پر قدرت اور بین الاقوامی زبانوں سے بھی واقفیت۔
(۱۵) فکر ودعوت

تعمیرِ معاشرہ کے لیے مسلم نوجوانوں کی راہنمائی

طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کسی علم میں امتیاز واختصاص پیدا کریں تو آپ دنیا کی آنکھوں کا تارا بن جائیں گے۔ان سب پر مستزاد تزکیۂ باطن ہے جو اگر میسر نہ ہو تو بقول علی میاں کتاب وحکمت بھی ناقص رہ جاتے ہیں۔ (۱۵)

اگر نوجوانانِ ملت اس لائحہ عمل کو اختیار کرلیں اور اسے اپنا نشانِ منزل بنالیں تو ہر طرح کے حالات میں اپنے باطنی جوہر کو محفوظ رکھ سکتے ہیں اور علم کا رشتہ اپنے رب سے جوڑ سکتے ہیں۔ جب علم کا رشتہ خالق کے ساتھ استوار ہو جائے گا تو پھر ہم ایک حقیقی اسلامی معاشرے کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔مولانا کے نزدیک تعمیر معاشرہ کے لیے مسلم نوجوانوں کو ایک مردِ مؤمن کی مثال ہونا چاہیے' جو اقبال کے الفاظ میں درج ذیل صفات کا حامل ہو:۔

ہاتھ ہے اللہ کا ' بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں' کارکشا' کارساز
خاکی و نوری نہاد' بندۂ مولا صفات ہر دوجہاں سے غنی' اس کا دل بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب' اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو ' گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو' پاک دل و پاکباز

مولانا کے خیال میں معاشرتی اور ملکی عدمِ استحکام کے لیے خطرات اور فتنے دو طرح کے ہوتے ہیں: خارجی اور داخلی۔ داخلی فتنے بعض اوقات خارجی فتنوں سے زیادہ خطرناک اور دوررس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ داخلی یا اندرونی کمزوریاں جب کسی معاشرے میں پیدا ہو جاتی ہیں تو اس معاشرے کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں' جیسے دیمک برگد یا املی کے درخت کو چاٹ جاتی ہے۔ بظاہر وہ مضبوط اور توانا کھڑا ہوا نظر آتا ہے لیکن دیمک اس کو اندر سے چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر چکی ہوتی ہے اور ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کوہ پیکر درخت کو زمین بوس کر کے رکھ دیتا ہے۔

مولانا علی میاں فرماتے ہیں کہ انسانیت کی بقا کی حقیقی ضمانت جری' دلیر' جانباز اور دردمند انسان ہیں' جو زخمی دل' اشکبار آنکھیں' سلگتے اور جلتے ہوئے دل ودماغ رکھتے ہیں' جو ناسازگار حالات کا سامنا کریں' چوٹ کو برداشت کریں اور تاریخ کے دھارے کو بدلنے کے لیے جان کی بازی لگادیں۔ جب کبھی اس جنس کی کمی نظر آتی ہے تو پورا سماج' پورا معاشرہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے —— پورے سماج میں چند درجن آدمی بھی ایسے نہ ہوں جو

اس ظلم کو‘ اس سفاکی کو‘ اس قساوت اور سنگدلی کو‘ کمزوروں پر دست درازی کو ناپسند کرتے ہوں اور اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کریں اور اس کو لے کر میدان میں آ جائیں! ایسے افراد کی جب کسی سماج میں‘ کسی معاشرہ میں کمی ہوتی ہے تو اس سماج‘ اس معاشرہ اور اس سوسائٹی کو کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ہے۔ حالات سے پنجہ آزمائی صرف وہ افراد کر سکتے ہیں جو ہمہ قسم خطرات کو مول لے کر زمانہ کا رُخ موڑ دیں‘ تب جا کر انسانیت کی کھیتی ان کی قربانیوں اور جُہدِ مسلسل کے پانی سے ہری ہوگی۔ (۱۶)

معاشرتی استحکام کے لیے خود احتسابی کی ضرورت

آج دنیا بھر میں‘ بالخصوص عالم عرب / عالم اسلام میں‘ کون سا ایسا معاشرہ ہے جس میں ظلم وستم‘ نفرت‘ مختلف تعصّبات‘ جماعتی گروہ بندیاں‘ مذہبی اختلافات‘ قتل و غارت‘ لسانی وتہذیبی تعصّبات‘ ریاستی بغاوت‘ مالی لالچ‘ بلیک میلنگ‘ الیکٹرونک و پرنٹ میڈیا‘ فحاشی‘ مال و دولت‘ ایجنسیوں‘ جمہوریت‘ بادشاہت‘ نام نہاد انسانی حقوق‘ فروغِ تعلیم‘ علاج معالجہ‘ طالبانائزیشن اور دیگر مختلف ہتھکنڈوں اور معاشرتی عدم استحکام کے ذریعے امن و امان کو تباہ و برباد کر کے وہاں کے مکینوں کی زندگی کو اجیرن نہیں کیا گیا؟ بقول شاعر ؎

میں نے دیکھی ہیں ہر اِک پھول کی آنکھیں پُرنم کیسے کہہ دوں کہ گلستاں میں بہار آئی ہے!

ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ عرب / عالمِ اسلام کے معاشروں کو ہمہ قسم داخلی و خارجی فتنوں سے بچایا جائے کیونکہ کسی بھی سلطنت کے استحکام کے لیے صحت مند معاشرے کا قیام ناگزیر ہوتا ہے۔ اس کے لیے معاشرے کے ہر فرد کو اپنا احتساب کرنا ہوگا کیونکہ دستِ قضا میں وہی قومیں صورتِ شمشیر رہا کرتی ہیں جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرتی ہیں‘ لیکن عصر حاضر میں اصلاحِ احوال و معاشرہ کی بابت اصل تشویش اس وقت ہے کہ جب بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی کرنے‘ فساد وانتشار پیدا کرنے والی طاقتوں سے آنکھیں ملانے والے اپنی سہولتوں‘ عزتوں‘ مال و دولت‘ عہدہ‘ منصب‘ اولاد‘ عزیز و اقارب اور اپنی نسلوں کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں اُترنے والے نایاب ہو جائیں۔

مولانا عالم عرب و عالم اسلام سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ نفاذِ اسلام کے لیے وہ عالم اسلام میں معاشرتی استحکام کو بنیاد تصور کرتے تھے‘ اس لیے انہوں نے اصلاحِ احوال کے لیے بالخصوص عالم عرب و عالم اسلام کو اپنی تقریروں وتحریروں‘ ماذا اخسر العالم بانحطاط المُسلمین (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) اسمعوھا صریحة منی‘ أیھا العرب‘ العسر بین الفکرة الاسلامیه و الغربیة (اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش) کے ذریعے جھنجھوڑا اور مفید مشورے دیے۔ لیکن اب وہ قیمتی مشورے کون دے گا؟ عالمِ عرب و عالمِ اسلام میں معاشرتی استحکام کے لیے حرمین شریفین میں بیٹھ کر کون دعائیں کرے گا؟ بقول جگر مراد آبادی ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اور بقول امیر مینائی ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

اللہ تعالیٰ عالمِ عرب / عالمِ اسلام میں اتحاد و یگانگت پیدا فرمائے اور اسلامی معاشروں کو انتشار سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

حواشی وحوالہ جات

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۵۸۔

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے:

(i) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تحفہ پاکستان، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد، کراچی ۱۹۱۹ء، ص ۲۰، ۲۱۔

(ii) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، خطابات علی میاں ۱۸۶/۴ تا ۲۸۷

(iii) مولانا ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، ۲۰۶/۵

(iv) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص ۱۹۷۹ء، ص ۴۶ تا ۵۰

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے:

(i) مولانا ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، ۷۹/۵

(ii) سفیر اختر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: حیات وافکار کے چند پہلو، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۶۔

(iii) مولانا ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۲۰ تا ۱۲۷۔

(۴) سفیر اختر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حیات وافکار کے چند پہلو، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۶، ۲۰۷۔

(۵) تفصیل کے لیے دیکھیے:

(i) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۰ اور ۵۶

(ii) سفیر اختر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حیات وافکار کے چند پہلو، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۲۵۵۔

(۶) مولانا ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، ۲۰۵/۵۔

(۷) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تحفہ پاکستان، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۶۸۔۶۹

(۸) تفصیل کے لیے دیکھیے:

(i) مولانا ابوالحسن علی ندوی، حالات کا نیا رخ اور علماء ودانشور طبقہ کی ذمہ داریاں

(ii) مولانا ابوالحسن علی ندوی، ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن علی گڑھ، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۔۱۲

(iii) مولانا ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، ج ۳، ص ۷۳، ۱۷۷

(iv) مولانا ابوالحسن علی ندوی، عالم عربی کا المیہ، ص ۱۶۱۔۱۶۰

(v) مولانا ابوالحسن علی ندوی، پاجا سراغ زندگی، ص ۹۱

(۹) ملاحظہ کیجیے:

(i) مولانا ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، ج ۳، ص ۷۳

(ii) سفیر اختر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حیات وافکار کے چند پہلو، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۲۰۶، ۲۵۴، ۲۵۵

(۱۰) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۹ء، ص ۳۶ تا ۵۷۔

(۱۱) تفصیل کے لیے دیکھئے:

(i) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۔۱۹

(ii) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، ص ۴۲۲۔۴۲۳

(iii) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، ج ۵، ص ۲۰

(iv) سفیر اختر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حیات وافکار کے چند پہلو، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۱۸۷، ۱۹۵ اور ص ۲۵۵۔۲۵۶

(۱۲) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، ص ۳۹۷۔۳۹۸۔

(۱۳) تفصیل کے لیے دیکھئے:

(i) مولانا ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی، ص ۱۳۴ تا ۱۳۶ اور ص ۳۹۷۔۳۹۸۔

(ii) علامہ ابوالحسن علی ندوی، حالات کا نیا رُخ اور علماء ودانشور طبقہ کی ذمہ داریاں، ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن علی گڑھ، ص ۱۳۔

(۱۴) تفصیل کے لیے دیکھئے:

(i) مولانا ابوالحسن علی ندوی، تحفہ پاکستان، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۶۔

(ii) مولانا ابوالحسن علی ندوی، جب ایمان کی یاد بہار چلی، ص ۲۹۱ تا ۲۹۳

(iii) مولانا ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام ناظم آباد، کراچی، ص ۴۰۳، ۴۰۴۔

(iv) پاجا سراغ زندگی، ص ۹۰، ۹۱، ۹۶، ۹۷

(۱۵) تفصیل کے لیے دیکھے:

(i) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، ج ۲، ص ۲۶۵، ج ۶، ص ۲۶۵، ج ۳، ص ۶۲۔۶۱

(ii) سفیر اختر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی حیات وافکار کے چند پہلو، ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۲۵۶، ۲۵۷

(iv) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۸ تا ۱۳۰

(۱۶) علامہ ابوالحسن علی ندوی، حالات کا نیا رُخ اور علماء ودانشور طبقہ کی ذمہ داریاں، ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن علی گڑھ، ص ۸، ۹۔

❁❁❁

اسلامی اسکولوں میں
ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں؟
ہر کتاب کو اسی زاویے سے دیکھئے!

سیّد خالد جامعی ☆

یہ ۲۰۱۱ء کی بات ہے' ہمارے عزیز دوست عمیر ثانی ایک بین الاقوامی ادارے Trade Key کے شعبہ کمپیوٹر میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور جدید دنیا سے بخوبی واقف۔ ایک دن انہوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت سے متعلق بعض استفسارات کیے اور بچے کے بدلتے ہوئے رجحانات' نت نئے میلانات کے بارے میں سوالات اٹھائے جو پری نرسری میں پڑھ رہا تھا تو راقم نے عرض کیا آپ کا بچہ کہاں پڑھتا ہے؟ معلوم ہوا کراچی کے سب سے بہترین اور مہنگے ترین اسلامی اسکول میں پڑھتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ اسکول چند مہینوں بعد یونیورسٹی میں تبدیل ہونے والا ہے' عملے کا تقرر ہو چکا ہے۔

اس اسکول کی نگران نہایت نیک سیرت' متحرک' مؤثر' مخلص اور راسخ العقیدہ مسلمان خاتون ہیں۔ ان کے شوہر ایک پریمیئر اسلامی بینک کے چیف ایگزیکٹیو ہیں۔ اسکول میں اسلامی اَقدار' روایات' حجاب' حیاء کا خاص خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے عمیر ثانی صاحب سے کہا کہ آپ کا بچہ جو انگریزی کتابیں پڑھتا ہے وہ لے آیئے۔ عمیر صاحب دوسرے دن کتابیں لے آئے۔ آکسفورڈ کی شائع کردہ ان کتابوں کا راقم نے ناقدانہ جائزہ لیا اور یہ جائزہ عمیر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ عمیر صاحب نے اگلے ہفتے اپنے بچے کا داخلہ منسوخ کرا دیا۔ یہ جائزہ اسکول کے اساتذہ کی خدمت میں بھی تفکر' تدبر اور تنقید کے لیے پیش کیا گیا' جن کا جواب صرف یہ تھا کہ ہم نے تو ان کتابوں کا کبھی اس طرح جائزہ نہیں لیا' نہ ان کتابوں کو اس قدر گہرائی سے دیکھا ہے۔ اساتذہ خود حیرت اور تعجب میں مبتلا تھے۔ ۲۰۱۴ء میں ہمارے ایک دوست' جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر فنانس کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کا بچہ بھی اسی اسلامی اسکول میں پڑھتا ہے' نے ہمیں بتایا کہ ان کا بچہ بہت اداس اور افسردہ ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ ابو! ہمارے گھر میں سب کچھ ہے مگر سوئمنگ پول (تیراکی کا حوض) کیوں نہیں ہے؟ بچے کے گھر میں دنیا کی ہر نعمت موجود ہے' صرف پانی کا حوض نہیں ہے تو اسے اپنا گھر حقیر نظر آتا ہے۔ هَلْ مِنْ مَزِید کا یہ طرزِ فکر' یہ احساسِ محرومی' بے بسی و بے کسی کا یہ اسلوب کس نے پیدا کیا؟

☆ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ' کراچی یونیورسٹی email: umairilyas403@googlemail.com

جدیدیت (Modrenism) کے پیدا کردہ معیارِ زندگی اور اس معیار میں مسلسل و مستقل اضافہ کا اصول ایک معصوم بچے کو بھی نفسِ مطمئنّہ سے محروم کر دیتا ہے۔ اس مسئلے کی بنیاد تلاش کرنے کے لیے ہم نے اپنے دوست کی خدمت میں تین سالہ پرانا تجزیہ پیش کیا۔ یہ تجزیہ ایک آئینہ ہے' جس میں بہت سے مخلص' راسخ العقیدہ' متقی' پرہیز گار لوگوں کے قائم کردہ اسلامی اسکولوں کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ تصویر جیسی بھی ہو اسے غور سے دیکھیے' آئینے کو توڑنے کی کوشش نہ کیجیے' صرف اس تصویر کو بدلنے کی کوشش کیجیے جو ہماری خواہش' آرزو' جستجو کے بغیر نادانستہ طور پر ہمارے آئینے نے تخلیق کر دی ہے۔ صرف ایک سوال پر مسلسل غور کرنے کی ضرورت ہے: کیا اس تصویر کو بدلا جاسکتا ہے؟

ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدید تعلیمی ادارے ہماری تاریخ نے تخلیق نہیں کیے' یہ ہم پر مسلط کیے گئے ہیں' اس نظام کو فی الحال بدلنا ممکن نہیں ہے اور ریاستی قوت کے بغیر اس کا فوری متبادل پیش کرنا بھی اس وقت ممکن نہیں' لہٰذا ہم حالت اضطرار میں ہیں۔ لیکن لمحۂ موجود میں امریکہ کینیڈا میں جدید اسکولوں کا متبادل ''گھر اسکول' امی اسکول اور ابو اسکول'' (Home School/ Mom School/ Dad School) وجود میں آچکے ہیں۔ دنیا کی تینئیس (۳۳) تہذیبوں کی طرح گھروں' بستیوں' محلوں میں قائم یہ غیر تجارتی (Non Commercial) مکتب جو ہمارے شاندار ماضی کی یادگار ہیں' مغرب کے موجودہ نظامِ تعلیم کے لیے موجودہ سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں سے بہت اچھے' سستے اور بہت بہتر طلبہ تیار کر رہے ہیں' جو اخلاقی طور پر اور صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت برتر ہیں۔ یہ اسکول ماں باپ نے خود اپنی مدد آپ کے تحت قائم کیے ہیں' کیونکہ صرف مادی کامیابی کے لیے تخلیق کیے گئے جدید اسکول مغرب کے بچوں کی مادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہیں اور بے شمار سنگین مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ مکتب قائم کرنے والے بہت مذہبی لوگ بھی نہیں ہیں' ان کا مقصد بچوں کی اخلاقی' روحانی' ایمانی' نورانی تربیت بھی نہیں ہے۔ محض مادّی احساسِ زیاں یعنی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کی خواہش' آرزو اور جستجو نے ان کو ایک نئے تجربے اور متبادل نظام پر آمادہ کیا اور وہ صرف مادی طور پر کامیاب ہوگئے۔ اس خالص مادّی ترقیاتی تجربے کو ہم ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر کے ایک سوال اٹھاتے ہیں۔ کیا جدید سیکولر تعلیمی اداروں میں اصلاحی' دفاعی اور انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ان اداروں کی بنیادوں اور مرتبۂ نصاب میں موجود زہر کا علاج ممکن ہے یا نہیں؟ ان میں اصلاح کا کتنا امکان ہے؟ یہ ہمارے سوچنے کا اصل میدان ہے۔

مغرب کے تمام ممالک جو سرمایہ دارانہ نظام کے نظریات لبرل ازم' سوشلزم اور سوشل ویلفیئر ازم پر یقین رکھتے ہیں' ان کا اجماع اصولاً آزادی' مساوات' ترقی کے عقائد پر ہے۔ یہ خدا' نبی' آخرت وغیرہ کے قائل نہیں۔ ان کا نظامِ تعلیم بھی انہی عقائد کے مطابق بچوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ تعلیم کا مقصد محض ترقی' لذتوں کا حصول' آزادی اور معیارِ زندگی میں مسلسل و مستقل اضافہ ہے۔ اس کے باوجود ایک مغربی سوشلسٹ ملک نے اسی مفاد پرست' حاسد' حریص تعلیمی نظام میں چند بنیادی اصلاحات' چند ترمیمات اور اضافوں کے ذریعے ڈاکٹر بننے والوں میں حرص و حسد و ہوس کے جذبات پیدا کرنے کے بجائے قوم پرستی اور انسان پرستی

کے ذریعے خدمت خلق کا ایسا جذبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے طبی مشن اس ملک کے ڈاکٹروں اور طبی عملے پر مشتمل ہیں' جو مختلف غریب اور کمزور ممالک میں بلا معاوضہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بیک وقت چھپن (۵۶) ہزار لوگ اس عمل میں شریک ہیں' مگر ان میں سے ایک بھی کسی دوسرے ملک کی شہریت قبول نہیں کرتا' جبکہ اس ملک میں ڈاکٹروں کی تنخواہیں بہت کم بلکہ دنیا میں سب سے کم ہیں۔ تفصیلات کے لیے نوم چومسکی کی کتاب Profit overpeople کا مطالعہ کیجیے۔ بڑے بڑے عالمی ادارے' UNO' UNICEF' WHO' OXfam' UNO' ریڈ کراس بھی اربوں کھربوں روپے کے فنڈ وصول کرنے کے باوجود اتنے بڑے پیمانے پر مفت طبی امداد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔

کفار اگر کفر کے نظامِ تعلیم میں تجربات کے ذریعے کچھ اصلاحات کر سکتے ہیں تو امتِ مسلمہ جو پندرہ سو سال کی تاریخ رکھتی ہے وہ اس نظامِ تعلیم میں جزوی اصلاحات کے لیے بھی کیوں آمادہ نہیں ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ عالم اسلام ایسی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہے؟ اس مثال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذکورہ ملک کا تجربہ عالمِ اسلام کے لیے کوئی عالی معیاری اور مثالی نمونہ ہے' بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ تبدیلی کی خواہش' ارادہ اور عزم ہو تو ہر طرح کے مشکل حالات اور سخت سے سخت نظام میں بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل آتا ہے۔ عالمِ اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدیدیت کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے مغلوب' مسحور اور مرعوب ہو گیا ہے' بلکہ وہ جدیدیت کے تمام مظاہر و آثار اسلامی تاریخ میں تلاش کر رہا ہے۔ جزئیات کی بنیاد پر کلیات اخذ کر کے مغربیت' جدیدیت اور لادینیت کی اسلامی تعبیریں پیش کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ لہٰذا عقل صرف ان امور میں استعمال کی جا رہی ہے جہاں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں' اور جہاں عقل کی ضرورت ہے وہاں مغرب کی کامل تقلید اختیار کر لی گئی ہے۔ مغرب کے فلسفے' اس کے علوم اور اس کے اداروں کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بجائے ہم اسلامی علمیت' اس کے مکاتب فکر' ان کے اختلاف' اسلام کے اداروں اور اس کی تاریخ کا ناقدانہ جائزہ لینے میں مصروف ہیں' لہٰذا مغرب محفوظ ہے اور اسلام مضروب' مجروح اور محبوس ہے۔

سرسید احمد خان عالم اسلام میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔ برعظیم پاک و ہند میں سرسید نے دو سو سال پہلے جدید سیکولر تعلیم کا آغاز کیا' مگر اُس وقت بھی انھیں یقین تھا کہ ''جدید تعلیم کے نتیجے میں ہندو' مسلمان' عیسائی کے دل میں بھی مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی' اور ان کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالکِ یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جا رہا ہے''۔ [حالی' حیاتِ جاوید' ہجرہ انٹرنیشنل پبلشر لاہور ۱۹۸۴ء طبع اول' ص ۲۲۴' ۲۳۳' باب پنجم]۔ تیسرا خطرہ خاص طور پر مذہب اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جا رہی تھی' جس سے مفر نہ تھا' یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں یہ تعلیم پھیلانی پڑی' حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے۔ [حیاتِ جاوید' دوسرا حصہ ص ۱۳۴' محولہ بالا] لیکن سرسید کی رائے تھی کہ اس تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے' لہٰذا یہ ناگزیر برائی ہے' چنانچہ اس کی خرابیوں کا ازالہ ہونا چاہیے' مگر عالم اسلام کے ماہرین تعلیم اور اسکولوں کے منتظمین میں عموماً اس بات کا احساس

نہیں ہے کہ جدید تعلیم کس طرح فکری ارتداد پیدا کرتی ہے اور اس کا امالہ کیسے ہونا چاہیے۔

سرسید احمد خان نے جدید سیکولر مغربی تعلیم کے مذہب دشمن اثرات سے بچانے کے لیے قرآن کی جدید تفسیر لکھی' جس کے نتیجے میں جدید نسل کی اصلاح تو کیا ہوتی البتہ اسلامی علمیت کی بنیادیں منہدم ہوگئیں' لیکن سرسید کی فکرمندی ہمارے لیے قابل غور ہے۔ حالی لکھتے ہیں: ''الغرض ان کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے ہونے کا اندیشہ ہے ان کا انسداد کیا جائے' اس مقصد کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے''۔ [حیاتِ جاوید' ص ۲۲۶]

اسلامی تاریخ میں علم کلام دین پر ہونے والے حملوں کا دفاع کرتا اور عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے اور اعتراضات وشبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ سرسید چراغ علی اور شبلی نے جو علم کلام ایجاد کیا' اس نے اسلامی علمیت پر ہونے والے تمام اعتراضات ہی کو قبول کرلیا' لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک نئے علم کلام کے لیے بھی کوئی محنت نہیں کی' بلکہ اس سیکولر نظام تعلیم کو ہم اپنا سمجھ کر قبول کر چکے ہیں۔ اس تقلید کے باعث ہم آج تک اس نظام کی تنقید تخلیق نہیں کر سکے۔

عجیب حکایت ہے کہ ایک انسان ایک شیر کے ساتھ کسی شہر کی سیر کر رہا تھا۔ سیر کرتے کرتے وہ ایک نمائش گاہ میں داخل ہوئے جہاں مصوری کے شاہکار رکھے ہوئے تھے۔ ایک شاہکار میں ایک شیر کو دکھایا گیا تھا جو زمین پر بے سدھ' بے یار و مددگار حیران و پریشان' ہکا بکا' نیم جاں پڑا ہوا تھا۔ شیر کی گردن پر ایک قوی ہیکل شکاری نہایت شان بلکہ تکبر کے ساتھ پیر رکھ کر مسکرا رہا تھا' اس کی کمر میں ایک بندوق بھی جھول رہی تھی۔ انسان نے شیر سے پوچھا یہ تصویر کیسی ہے؟ شیر نے کمال بے نیازی سے تصویر کو دیکھا اور جواب دیا ''یہ تصویر انسان نے بنائی ہے''۔ دوسرے معنوں میں یہ تصویر شیر نے نہیں بنائی' ورنہ صورت حال مختلف ہوتی۔ سوچنے کا یہ زاویہ زندگی' حرکت' حرارت اور تازگی کی علامت ہے۔ یہ زاویۂ نظر کسی لمحے بھی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بدترین عذاب کسی قوم پر یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم فکر صحیح سے محروم ہو جائے۔ فکر صحیح ہو تو راکھ سے بھی نشیمن تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ذرّہ صحرا' پتی گل' گل گلزار' دریچہ' دروازہ اور دیوار بن سکتا ہے۔

جدید سیکولر تعلیمی ادارے ہم نے نہیں بنائے۔ دنیا کی تئیس تہذیبوں میں اس طرح کے تعلیمی اداروں کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی نظامِ تعلیم' مادہ پرستی' شکم اور شہوت پرستی کی بنیاد پر تعمیر نہیں کیا گیا۔ ہر تعلیمی نظام کسی اعلیٰ ترین تصورِ خیر (Meta Narrative) کی فوقیت اور فروغ کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ تعلیم کا مقصد روٹی کمانا نہیں تھا' علم حقیقت مطلقہ (Absolute Reality) اللہ رب العزت کی معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ تھا۔ مگر عصر حاضر میں تعلیم کا اصل مقصد آزادی' مساوات اور ترقی کا حصول ہے' لہٰذا علم وہ ہے جس سے مال و دولت کثرت سے حاصل ہوتے ہوں' لہٰذا ہر شخص حصول دولت کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے اس کی دلیل بھی موجود ہے۔ اگر آج دنیا کی تمام حکومتیں اعلان کر دیں کہ کسی سرکاری/ غیر سرکاری یونیورسٹی سے سند لینے والے کو کسی ادارے میں ملازمت نہیں ملے گی تو تمام اسکول یونیورسٹیاں ویران ہو جائیں گی۔ یہ تعلیم علم کے لیے نہیں' روٹی کمانے کے لیے ہے۔ اس کا تعلق العلم سے نہیں' صرف عقلی علوم' سائنس' سوشل سائنس' آرٹ

کرافٹ اور فنون سے ہے' جسے دنیا کی تئیس تہذیبوں میں علم نہیں سمجھا جاتا تھا' اور تجربی' سائنسی' حسی' عقلی علوم کو علوم کی تلچھٹ کہا جاتا تھا۔ اسی لیے سقراط' افلاطون اور ارسطو کے ہاتھوں سوفسطائیوں کو شکست ہوئی تھی جو پیسے لے کر فنون بیچتے تھے اور اسے علم کہتے تھے۔ علم خرید و فرخت کی شے نہیں ہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ اگر بچہ اسکول' کالج' یونیورسٹی سے علم حاصل کر کے پیسہ نہ کمائے تو کیا کرے؟ علم سے شعور' اعتماد' عزت' دولت' شہرت ملتی ہے تو اس کے حصول میں کیا ہرج ہے؟ یہ دلیل بہ ظاہر مضبوط ہے لیکن حقیقتاً کم زور ہے' کیونکہ اب دنیا میں پیسہ کمانے کے لیے علم نہیں کرتب بازی کی ضرورت ہے۔ مثلاً فٹبال' کرکٹ' اسکواش کھیلنے والے جاہل کھلاڑی ارب پتی بن جاتے ہیں۔ فلم اور ٹی وی میں کام کرنے والے جاہل اینکر پرسن' پانسے پھینکنے والے سٹے باز (risk managers)' جاہل صحافی' مسخرے بھانڈ' اداکار' کسبیاں کھربوں روپے کماتے ہیں۔ جاہل سٹے باز' حجام' درزی' جن کو اب فیشن ڈیزائنر کہتے ہیں' آرٹسٹ' فوٹوگرافر' مصور' ماڈل' رقاص اعلیٰ تعلیم کے بغیر اتنا دھن کماتے ہیں کہ انسان اس کا تصور نہیں کرسکتا۔ عزت اُسی کو ملتی ہے جو مال و دولت میں سب سے آگے ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ علم سے دولت ملتی ہے جدیدیت اور مغربیت سے ہماری ناواقفیت کا عمل ہے۔ کینیڈا میں ٹرک ڈرائیور ڈاکٹر سے زیادہ پیسے کماتا ہے' برطانیہ میں تندور پر روٹی لگانے والے کی تنخواہ ڈاکٹر سے زیادہ ہے۔

ٹنڈو جام یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے روزنامہ جنگ کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کا بیٹا حجام بننا چاہتا ہے۔ صحافی کو حیرت ہوئی تو جواب ملا: جن دنوں میں امریکہ میں مقیم تھا ہمارے محلے میں ایک حجام تھا جس سے ہم بال کٹواتے تھے' اُس کی آمدنی مجھ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ تو بیٹے نے کہا کہ ابو آپ سے بہتر تو یہ حجام ہے جو اتنا کما لیتا ہے! جب تہذیب کا نقطۂ کمال مال کی فراوانی اور تعیش کی ارزانی ہو تو یہ تصورِ خیر ایک نئے انسان کی تعمیر کرتا ہے جسے ہم جدید انسان (modren man) کہتے ہیں۔ جدید تعلیمی اداروں سے ایسے ہی لوگ نکلتے ہیں۔

جاہل سیاست دان بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور راتوں رات کروڑ پتی' ارب پتی' پھر چند سالوں میں کھرب پتی ہو جاتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا صرف پاکستان اور تیسری دنیا کے ممالک میں ہوتا ہے' لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت امریکہ اور بھارت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ ریگن ہالی ووڈ کا ایک اداکار امریکہ کا صدر بن سکتا ہے اور واجپائی' مودی جیسے جاہل بھارت کے وزیراعظم بن جاتے ہیں۔ جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے' پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے نیوز ویک کے سابق مدیر اور صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن فرید زکریا کی کتاب The Future of Freedom پڑھیے' دنیا بھر کی جمہوریتوں کے جاہل سیاستدانوں کی تاریخ آپ کو مل جائے گی۔ فرید زکریا نے لکھا ہے کہ امریکہ میں ۸۵ فی صد فیصلے کانگریس اور سینٹ میں عوام کے نمائندے نہیں کرتے بلکہ لابیاں' پریشر گروپ اور مختلف گروہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے الیکشن جیتنے اور ہارنے کے لیے کھربوں روپے کی امداد دینے والے اپنے مفادات کیوں حاصل نہ کریں! تعلیم' سیاست' علم سب کا ایک ہی مقصد ہے سرمایہ میں اضافہ' جس سے آزادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی عہد حاضر کا مذہب ہے' اسے سرمایہ دارانہ نظام بھی کہتے ہیں۔

جدید اسکول ہمیں وہ سانچے مہیا کرتے ہیں جس کے ذریعے ہم استعمار کی غلامی قبول کرتے اور اس کے پیدا کردہ مقاصدِ زندگی کو الحق سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے مغرب کے مقابلے پر ہماری سیاسی عسکری شکست کو تہذیبی شکست میں بدلتے ہیں اور نوکری اور ترقی کو زندگی کا اصل مقصد بنا کر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مسلسل و مکمل رہنمائی اور بھاری بھرکم نصاب کے ذریعے کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ سوچنے' جانچنے پرکھنے کے تمام فطری پیمانوں کو توڑ کر صرف ایک طریقے سے سوچنا سکھاتے ہیں۔ مارکوزے کے الفاظ میں یک رخا آدمی (one dimensional man) پیدا کرتے ہیں جو صرف مغرب سے ہی وفادار رہ سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں ان اسکولوں سے نکلنے والی نسل کے لیے دین کے سوا زندگی کے تمام شعبوں میں عقل کا استعمال ممنوع و حرام ہو جاتا ہے۔ عقل صرف دین پر تنقید اور دین کی جدید تعبیر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ نظامِ تعلیم و تربیت اتنا مہلک ہے کہ جہاں عقل استعمال کرنی چاہیے وہاں دین کو لے آتے ہیں۔ جہاں دین' روایت' نقل' وحی پر اعتماد کرنا چاہیے وہاں عقل لے آتے ہیں۔ لہٰذا جدید تعلیمی نظام سے جو خلقِ جدید برآمد ہوتی ہے وہ مذہب اور اسلام پر ہونے والے کسی اعتراض کا جواب دینے کے قابل نہیں ہوتی' اور ہر اعتراض کو حقیقت سمجھ کر قبول کرتی اور اپنی تاریخ اور تہذیب سے دستبردار ہو جاتی ہے۔

جدید دور میں سب سے زیادہ آمدنی (incom) سٹے باز (risk manager) کی ہوتی ہے۔ اس کے پاس صرف قیاس' گمان' ظن' تخمین کا علم ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک خاص حس' جذبہ' حوصلہ اور ولولہ ہوتا ہے جس کا علم اور سند کسی تعلیمی ادارے سے نہیں ملتی۔ دنیا کا سب سے بڑا سٹہ باز جارج سوروس (J. Soros) بس اندازے پر کھیلتا ہے۔ وہ کھرب پتی ہے' اُس نے ملائیشیا کی معیشت کو اسٹاک مارکیٹ کے ذریعہ تباہ کر کے ایشین ٹائیگر کو ایک رات میں پیپر ٹائیگر بنا دیا تھا۔ اس عالمی سٹے باز کی بے پناہ آمدنی اور علم سے متعلق تفصیلات کے لیے نائیل فرگوسن کی کتاب The Ascent of money پڑھ لیجیے۔

جدیدیت (Modrenism)' لادینیت (Secularism) اور سرمایہ داری و جمہوریت (Capitalism & Democracy) کی پیدا کردہ جدید دنیا میں شہرت' عزت اور دولت کا معیار علم نہیں' بلکہ سائنسی علم بھی نہیں' بلکہ علم کا معیار یہ ہے کہ کون اپنے کام' فن سے سب سے زیادہ سرمایہ پیدا کر سکتا ہے' کیونکہ آزادی صرف سرمایہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے مغرب میں کام (work) کی تعریف یہ ہے کہ جس سے سرمایہ حاصل ہو۔ کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے' یعنی جو شخص کام نہیں کرتا' سرمایہ نہیں کماتا' وہ اپنی آزادی کا انکار کرتا ہے۔ آزادی مغرب کا بنیادی ایمان و عقیدہ ہے' لہٰذا آزادی اور سرمایہ کا منکر پاگل ہے۔ فوکالٹ لکھتا ہے The absence of work is madness..... اسی لیے گھر میں تیرہ بچوں کو پالنے والی عورت کے کام کو مغرب کام تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے سرمایہ نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عورت باہر جائے' کمائے تو اسے working woman کہتے ہیں۔ رنڈی اپنی ملکیت جسم کو بیچ کر سرمایہ کما کر اپنی آزادی میں اضافہ کرتی ہے' لہٰذا اسے طوائف نہیں sex worker کہتے ہیں' محنت کے ذریعے آزادی اور سرمایہ جیسے عظیم کام انجام دینے والی عورت۔ جدید سیاسی فلسفے کا سب سے بڑا مفکر جان رالز جس کی کتاب Theory of Justice جدید ریاستوں میں عدل کے موضوع پر ''انجیل'' سمجھی جاتی ہے'

وہ لکھتا ہے کہ ہر انسان کو چار بنیادی خیر (four primary goods) حاصل ہونے چاہئیں: آمدنی' دولت' قوت اور اقتدار (incom/ wealth/ power/ authority)۔ان چار بنیادی خیر کے بعد ہی کوئی شخص اپنی آنکھوں میں عزت وتکریم (self respect) کے قابل ہوسکتا ہے۔دوسرے معنوں میں کوئی شخص اپنی نگاہ میں بھی ان چار بنیادی اسباب کے بغیر عزت کے قابل نہیں۔جس شخص کو اپنی نگاہوں میں ان چار عقائد کے بغیر عزت حاصل نہیں اسے دوسرے کی نگاہوں میں عزت کیسے مل سکتی ہے؟ جدید نظام تعلیم ہمیں یہی عزت دلانے کا فریضہ انجام دیتا ہے کہ عزت کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں۔دوسرے معنوں میں ہمارے عقیدے' ایمانیات اور مابعد الطبیعیات بھی بدل چکے ہیں' لہٰذا جس کے پاس مال و دولت اور اسباب کی فراوانی نہیں ہے وہ عزت کے قابل ہی نہیں ہے۔افسوس کہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے لوگ اس پیمانے پر پورا نہیں اترتے۔

دنیا بھر میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً سائنس کو برتر علم جانا جاتا ہے' لیکن سائنس دان (scientists) کی مغرب میں اتنی عزت نہیں کی جاتی جتنی عزت سٹے باز (risk managers)' رنڈیوں' مراثیوں' بھانڈوں (showbuisness stars) اور کھلاڑیوں (sports men) کی ہوتی ہے۔عزت کا پیمانہ مغرب اور دنیائے جدید (modren age) میں صرف مادّی ہے اور وہ ہے پیسہ۔جو زیادہ کماتا ہے وہ زیادہ عزت پاتا ہے۔سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز کماتے ہیں' اس کے بعد رنڈیاں اور کھلاڑی وغیرہ' اس کے بعد سائنس دانوں کا نمبر آتا ہے' کیونکہ سٹے باز اور رنڈیاں سرمایہ کی پیداوار میں سائنس دانوں سے زیادہ بہتر ہیں۔مثلاً عالمی اولمپکس کے ایک ہفتے کے کھیل سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے امریکہ کی تمام یونیورسٹیاں سال بھر میں اتنا سرمایہ پیدا نہیں کر سکتیں۔صرف امریکہ میں عریانی وفحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ پیدا کرتی ہے دنیا کی کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں (جن میں مائیکروسافٹ جیسی کمپنی بھی شامل ہے) اجتماعی طور پر بھی اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتیں۔کرس ہیجز کی کتاب دیکھ لیجیے۔

> *World wide porn revenues topped 97 billion Dollar in 2006. That is more than the revenues of Microsoft, GoogleAmazon, eBay, Yahoo, Apple, Net flix & Earth link combined. [Chris Hedges., Empire of illusion : The end of literacy & the triumph of spectalce , Nation Books USA 2009, p. 58]*

لہٰذا زیادہ اجرتیں (salaries/wages) اسے ملے گی جو زیادہ سرمایہ پیدا کرے گا۔برکلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تنخواہ یونیورسٹی کے فٹ بال کوچ سے کم ہے۔فٹ بال کوچ سالانہ تین ملین ڈالر کماتا ہے اور وائس چانسلر تین لاکھ ڈالر بھی نہیں کماتا۔ایک فٹ بال میچ سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے برکلے اتنا سرمایہ کئی سالوں میں نہیں پیدا کر سکتی۔کرس ہیجز اپنی کتاب The impire of illusion میں لکھتا ہے:

> *The football coach is Berkeley's highest paid employee. He makes about 3 million dollar. [p. 94]*

کرس ہیجز اسی کتاب کے باب Illusion of Love میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں ایک اعلیٰ ترین رنڈی (prostitute) تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ کماتی ہے۔آج کل اسے آرٹسٹ' فلم اسٹار' فلمی ستارہ' sex worker اور porn star کہا جاتا ہے' لیکن اس پیشے کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے سب سے بہترین لفظ یہی ہے۔

The porn stars make anywhere from 1500 dollar to 3000 dollar an hour as prostitute. [p. 68, ibid]

اگر یہ رنڈی روزانہ بارہ گھنٹے کام کرے تو اس کی روزانہ کی آمدنی ۳۶ ہزار ڈالر ہے جو ایک امریکی استاد کی سالانہ آمدنی ہے۔ یہ رنڈی ماہانہ دس لاکھ اسی ہزار ڈالر کماتی ہے جبکہ امریکی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے۔ رنڈی کا لفظ اب متروک ہو گیا ہے' کیونکہ معاشرے میں گناہ اور گناہ گار کو پسند کیا جا رہا ہے۔ اسے برداشت (tolerance) کہتے ہیں۔ یہ آزادی کے عقیدے کا نتیجہ ہے کہ ہر پھول کو کھلنے دو' آپ نیک کام کریں' دوسرے کو برے کام کرنے دیں' دونوں کا حق ہے۔ عہد حاضر حق (right) کے منہاج کا عہد ہے' آپ جو چاہے کریں کہ حق (good) کچھ نہیں ہوتا' یہ ہر شخص کا محض دعویٰ ہوتا ہے' ہر شخص کو حق (right) ہے کہ جسے خیر (good) سمجھے اپنی ذاتی زندگی میں اسے خود اختیار کرے' دوسرے کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے۔ اپنی مرضی' آزادی' اختیارِ مطلق سے آپ جس خیر کو اختیار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں خیر کی بحث بے معنی ہے' خیر کچھ نہیں ہوتا' اصل چیز پیسہ ہے' بس پیسے کماؤ' جدید نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کا یہی مقصد ہے۔

حسین نصر نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ مغرب میں اسپورٹس ہیرو کی ایک سال کی آمدنی ایک بہت بڑے سائنس دان اور عظیم مفکر کی پوری زندگی کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے۔

There are now sports heroes who make more of a salary in one year than the greatest westren scientists or scholars will do in his or her life time. [S. H. Nasr: A Young Muslim's guide to the modern world, Suhail Academy Lahore, 1988, p.232]

مشہور فلسفی مائیکل سانڈل لکھتا ہے کہ امریکہ میں اسکول کا ایک عام استاد ایک سال میں ۴۳ ہزار ڈالر کماتا ہے' لیکن ڈیوڈ لیٹر مین جو رات گئے فحش گوئی کے پروگرام کی میزبانی کرتا ہے اس کی سالانہ آمدنی اکتیس ملین ڈالر ہے۔ امریکہ کا سب سے عاقل' اہم ترین آدمی' سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے اور ایک ٹیلی ویژن شو کی جج جوڈی ایک سال میں ۲۵ ملین ڈالر کما لیتی ہے۔

☆ *The average school teacher in the United States makes about $43,000 per year. David Letterman, the late-night talk show host, earns $31 million a year.*

☆ *John Roberts, chief justice of the U.S. Supreme Court, is paid $217,400 a year. Judge Judy, who has a reality television show, makes $25 million a year. [Justice, What's The Right Thing To Do?, Michael J. Sandel ,p.162]*

اس صورت حال میں بچے اسکول جانا پسند کریں گے یا وہ کام کرنا پسند کریں گے جس کے حصول کے لیے صبح سے رات تک پڑھنے لکھنے اور سر کھپانے کی ضرورت نہیں' جس سے ان کی آمدنی بے پناہ ہو جائے؟

اسلامی اسکولوں میں جب آپ بچے کو اسلام' آخرت اور بہترین آمدنی' بہترین معیارِ زندگی' بہترین دنیا'

یعنی دو مختلف تصوراتِ خیر کی طرف بلاتے ہیں تو بچہ کون سا تصورِ خیر اختیار کرے گا؟ اگر آج کی نسل معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے غیر اخلاقی پیشوں کو بے تابانہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اس کا سبب ہمارے غلط نظریات ہیں۔ ہر تہذیب میں تصورِ خیر (concept of good) صرف ایک ہوتا ہے۔ اسلامی تہذیب کا تصورِ خیر توحید ہے' مغرب کا تصورِ خیر آزادی ہے' جس کی دو شکلیں ہیں: ایک تجریدی (abstract) یعنی ووٹ (vote) دوسری ٹھوس (concrete) وہ ہے سرمایہ (capital)۔ سرمائے کے بغیر آزادی کا حصول ممکن نہیں اور جدید نظامِ تعلیم اور اس کے قائم کردہ ادارے سرمایہ داری کے لیے شاہ دولہ کے چوہے (corporate slaves) پیدا کرتے ہیں۔ یہ غلام سرمایہ' عیاشی' آزادی کے سوا کچھ اور سوچنے' کچھ اور کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ جس طرح دریا کا پانی بہہ کر سمندر کی طرف جاتا ہے' جس طرح کچھوے کا بچہ اس زمین پر آنکھ کھولتے ہی سمندر کا رخ کرتا ہے' اسی طرح جدید نسل تعلیم کے بحر سے باہر نکلتے ہی دنیا پرستی اور عیش پرستی کی طرف دوڑتی ہے۔

تصورِ خیر کی بحث بنیادی بحث ہے۔ خیر (good) اُس پیمانے کو کہتے ہیں جس پر ہر شے کو پرکھا جا سکے' لہٰذا پیمانہ ہمیشہ ایک ہوتا ہے' پیمانہ کبھی دو نہیں ہو سکتے۔ جب ہم دین اور دنیا کو برابر سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ A=B دوسرے معنوں میں B=A۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ دین کو دنیا کے پیمانے پر پرکھا جائے گا یا دنیا کو دین کے پیمانے پر پرکھا جائے گا؟ اگر دونوں برابر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کو دنیا کے پیمانے پر پرکھنا بالکل درست ہے' لہٰذا عصرِ حاضر میں دین وہی ہے جو دنیا کے پیمانے پر پورا اترے۔ سرسید اور شبلی کے الفاظ میں سچا دین وہ ہے جو جدید تہذیب و تمدن اور زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکے۔ تفصیلات کے لیے حالی کی حیاتِ جاوید' ضیاء الدین لاہوری کی افکارِ سرسید' شبلی نعمانی کی علم کلام اور الکلام' اور سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی کا مطالعہ کیجیے۔ دوسرے معنوں میں ہم دین کے مطابق ڈھلنا نہیں چاہتے' بلکہ دین کو اپنے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ ہم قرآن و سنت کے مقلد نہیں' شریعت ہماری مقلد ہے۔ شریعت حَکَم نہیں' ہمارا نفس حَکَم ہے۔

چونکہ دین اس امتحان میں ناکام ہے' وہ دنیا پرستی' مادّہ پرستی (materialism) اور مادہ پرستی (women worship) اور عیش پرستی کی دلیلیں مہیا کرنے سے قاصر ہے' لہٰذا دین کی تشکیل جدید (Reconstruction of Religious thought)' تعبیرِ نو' تعمیرِ نو' بلکہ تخریبِ نو کا کام زور و شور سے جاری ہے۔ ہماری نئی نسل اگر دنیا پرست بن گئی ہے' بہترین مستقبل کے لیے ترکِ وطن کر کے دارالحرب میں قیام اگر اس کی اولین ترجیح ہے' اگر عالم اسلام سے ذہانت کا انخلا (brain drain) ہو رہا ہے' ہر شخص دولت کے زیادہ سے زیادہ حصول کو اگر اپنا مقصدِ زندگی بنا چکا ہے' تو اس کا سبب ہمارا یہ نیا عقیدہ ہے کہ دین و دنیا برابر ہیں۔ کیونکہ دنیا پہلے ہے آخرت بعد میں' لہٰذا دنیا پہلے دین بعد میں۔ بعض جدیدیت پسند کہتے ہیں کہ قرآن میں بھی یہی آتا ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنا فِی الدُّنیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً.....﴾(البقرۃ: ۲۰۱) ڈاکٹر حسین نصر کے بیٹے ولی رضا نصر کی کتاب Islamic Capitalism اب نئے نام Meccanomics سے منظرِ عام پر آئی ہے' جو اسلامی دنیا میں سرمایہ دارانہ اسلام یا اسلامی سیکولرازم کے جدید مظاہر' آثار سے آگاہ کرتی ہے' جو مغرب کو مطلوب ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے ایسی ہی نسل تیار کر رہے ہیں جو رسوم و رواج' عادات و اطوار اور بعض مظاہر کی سطح پر مذہبی

ہو' لیکن ذہنی' قلبی' عقلی طور پر مادّہ پرستی کی غلام ہو۔

جب آپ مغربی تصورِ خیر ''زیادہ آمدنی بہترین معیارِ زندگی'' بلکہ معیارِ زندگی میں مستقل اور مسلسل اضافے کو بھی اسلامی تصورِ خیر کے طور پر قبول کریں گے کہ اس میں کیا ہرج ہے تو آپ کی بیٹی شریف عورت' بیوی' ماں نہیں' سپر اسٹار بننا پسند کرے گی۔ آپ کے بچے عالم دین نہیں بنیں گے' کیوں کہ یہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ نہ وہ کسی ایسے پیشے اور فن کو اختیار کریں گے جس میں کم پیسے ملتے ہوں' کیونکہ زندگی کا مقصد آزادی (freedom)' سرمایہ کا ارتکاز (accumalation ofcapital) معیارِ زندگی کے خدا کی پرستش (worship of standard ofliving)' HDI میں اضافہ اور عیش وعشرت' لذت پرستی (hendonism) ہے۔ علم وہ ہے جس سے ترقی اور اچھی نوکری ملے۔ اتنا پڑھ لکھ کر اگر اتنے کم پیسے ملتے ہیں تو ایسے علم کا کیا فائدہ؟ جب زندگی کا مقصد معیارِ زندگی میں اضافہ ہے تو اس مقصد کی خاطر دین' اخلاق' تہذیب' تمدن' اَقدار و روایات سب کچھ قربان کی جاسکتی ہیں۔ ہر عقیدہ اور ایمان' خواہ صحیح ہو یا غلط' اُس کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ دنیا پرستی کی ایک قیمت ہے جو نئی نسل ادا کرنا چاہتی ہے۔ دین و دنیا کو یکساں سطح پر رکھنے کی بھی ایک قیمت ہے۔ بالکل اسی طرح توحید پرستی کی بھی ایک قیمت ہے' جو سب کو معلوم ہے' مگر ہم اسے ادا کرنا نہیں چاہتے' لہٰذا مذہبی تاویلوں میں الجھے رہتے ہیں۔ دو مختلف بلکہ متضاد تصوراتِ خیر کو یکساں سمجھنے کی اس بنیادی غلطی کے باعث ہمارے اسلامی اسکولوں میں دی گئی اسلامی تعلیمات' تجوید کے اسباق' ان بچوں کی درست سمتِ سفر متعین نہیں کرسکیں گے۔

جدید اسکول اٹھارہویں صدی کے جدید مغرب کی ایجاد ہیں' لہٰذا ان اسکولوں اور اس کے نظام سے وہی تصویریں نکلیں گی جو مغرب کو پسند ہیں۔ اصل سوال وہ ہے جو شیر کے جواب میں پنہاں ہے کہ یہ تصویر میں نے نہیں بنائی ورنہ میں شیر کی تقدیر بدل دیتا۔ یہ تصویر شیر بناتا تو انسان وہاں ہوتا جہاں اب شیر کو دکھایا گیا ہے' یعنی شیر کے قدموں میں۔ بالکل اسی طرح یہ جدید مغربی اسکول ہماری علمیت' اسلامی تاریخ و تہذیب نے تخلیق نہیں کیے' مگر اب یہ اسکول مغرب سے متاثر ہو کر ہم نے بھی بنا لیے ہیں تو کم از کم ان اسکولوں سے نکلنے والی نسل کی تصویر کیسی ہونی چاہیے؟ ہم سب کا دینی' ملی' اخلاقی' تہذیبی' ایمانی فریضہ ہے کہ اس سوال کا جواب مل جل کر تلاش کریں۔ ابتدائی کوشش کے طور پر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے متذکرہ بالا اسلامی اسکول کی کتابوں کا مختصر تجزیہ پڑھیے:

پہلی کتاب The Pan Cake کہانی ہے۔ شیف یعنی باورچی سر پر سفید ٹوپی اوڑھے سفید کوٹ پہنے ہوئے نہایت مہذب طریقے سے باورچی خانے میں کیک بنانا سِکھا رہا ہے: ایک پیالہ لو' اس میں آٹا اور انڈے (eggs and flour) ڈالو اور اس میں دودھ (milk) ڈالو۔ ان اجزاء کو پھینٹ لو۔ اب حلوہ بھوننے والے برتن (فرائنگ پین) میں مکھن ڈالو۔ باورچی مکھن برتن میں ڈال کر اس میں دودھ' انڈے' آٹے کا آمیزہ شامل کر دیتا ہے' اور پھر کیک بن جاتا ہے۔ وہ کیک ہوا میں اچھال کر کرتب دکھا رہا ہے۔ باورچی خانہ میں کُتّا بھی بیٹھا ہوا ہے۔ بچے کیک کے اچھلنے کا منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ بچے برتن ہاتھوں میں پکڑ کر دوڑ رہے ہیں اور کیک اچھال کر اسی برتن میں گرا رہے ہیں۔ یہ کمالات ہیں۔ ایک لڑکی کیک اچھالتی ہے تو وہ کیک فرائی پین

میں واپس گرنے کے بجائے محترمہ کے سر کو چھو لیتا اور وہیں قیام پذیر ہو جاتا ہے۔ پیچھے آنے والا ہجوم چیخ رہا ہے' خوش ہو رہا ہے' تالیاں بجا کر شور مچا رہا ہے۔ لکھا ہے: The Pan cake race۔ اسلامی اسکول میں تہذیب کا سبق ہم مغربی طور طریقوں سے سیکھتے ہیں۔ اس کی دلیل عموماً یہ دی جاتی ہے کہ مغرب کی غالب تہذیب' تمدن' معاشرت سے واقفیت ضروری ہے' اگر ہم مغرب کی چیزوں سے واقف نہ ہوئے تو مغرب سے بہت زیادہ مرعوب ہوں گے۔ واقفیت اس مرعوبیت کو کم کر دے گی۔

دوسری کتاب کا نام ہے Who is it?۔ ایک چراغ جل رہا ہے' بچہ سامنے کھڑا ہے' پیچھے کھڑے ہوئے دو بچوں کا سایہ دیوار پر پڑ رہا ہے۔ بچے سایہ دیکھ کر حیران ہیں' پوچھتے ہیں Who is it? بچے بتاتے ہیں کہ یہ Biff اور Chip کا سایہ ہے۔ پھر امی اور Kipper کا سایہ آجاتا ہے۔ امی ہاتھ میں مچھر مار آلہ لے کر ایک مکھی مار رہی ہیں۔ پھر کُتّے کا سایہ آتا ہے' پھر خلائی انسان (Space man) کا سایہ نظر آتا ہے۔ بچے حیران ہیں کہ خلا نورد یہاں کیسے آ گیا ہے؟ پھر والد محترم ہنستے ہوئے آتے ہیں۔ بچے کہتے ہیں: No, Its Dad ارے یہ تو ابو جان ہیں! موصوف کے منہ میں سگار ٹائپ پائپ لگا ہوا ہے' جنگل کے طوطوں جیسے رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ عصر حاضر کا رنگ یہی ہے' بڑے بوڑھے اور مذہبی لوگ بھی اب شوقیہ رنگ برنگے کپڑے پہنتے ہیں اور سفید کپڑے پہننے والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر' نرس' باورچی' ٹریفک پولیس' نیوی کے افسروں سے نہیں پوچھتا کہ تم ہمیشہ سفید کپڑے کیوں پہنتے ہو؟ کوئی ڈاکٹر سے نہیں پوچھتا کہ زخمی کو ہمیشہ سفید پٹی کیوں باندھتے ہو؟ کوئی پولیس اور فوجی سے نہیں پوچھتا کہ ہمیشہ ایک رنگ کا لباس کیوں پہنتے ہو؟

تیسری کتاب کی کہانی ہے The Lost Teady۔ امی اور بیٹا سفر کے لیے نکلتے ہیں تو منے میاں بھالو لے کر بس میں بیٹھتے ہیں۔ بس سے اترتے ہوئے بچہ بھالو نشست پر بھول جاتا ہے۔ بس چلی جاتی ہے اور بچہ رونے لگتا ہے' میرا بھالو' میرا بھالو۔ گھر پہنچتے ہیں تو منے میاں نہایت غمزدہ' آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ اداسی نے گھر کے در و بام پر اپنے بال پھیلا دیے ہیں۔ تمام بہن بھائی طرح طرح کے قسم قسم کے کھلونوں کا ان کے بستر پر ڈھیر لگا دیتے ہیں' مگر وہ تمام کھلونے مسترد کرتے ہیں' کوئی ان کو پسند نہیں آتا' کسی پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ عالی شان گھر کے عالی شان کمرے میں گھڑی لگی ہے' مہنگا ٹیبل لیمپ رکھا ہے' شان دار مسہری ہے' قیمتی خوبصورت قالین (کارپیٹ) بچھا ہوا' نرم نرم موٹے موٹے تکیے ہیں' کرسی پڑی ہوئی ہے' دیواروں پر مصوری کے شاہکار لگے ہیں' کھڑکی میں بہت بڑا شیشہ لگا ہے جس سے رات کا منظر' عمارتیں' چاند' ستارے' پودے' درخت سب نظر آ رہے ہیں' مگر منے میاں کا غم کم نہیں ہوتا' آنسو تھمتے نہیں' ہچکیاں' سسکیاں بند نہیں ہوتیں۔ روتے روتے سو جاتے ہیں۔ رات جیسے تیسے گزر جاتی ہے۔ صبح سویرے امی ان کو بس کمپنی کے دفتر لے جاتی ہیں جہاں مسافروں کی کھوئی ہوئی اشیاء املاک وغیرہ' Lost Property کا مال خانہ (اسٹور) ہے' جہاں بس سے ملنے والی اشیاء جمع کی جاتی ہیں اور مسافروں کو واپس کی جاتی ہیں۔ منے میاں کو بھالو مل جاتا ہے' ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یہ کس قسم کا بچہ خلق ہوا ہے جو دنیا بھر کے کھلونے پا کر بھی خوش نہیں ہے اور اس بچے کی تعلیم و تربیت' اصلاح کرنے والا بھی کوئی نہیں' سب اُس کی ہر خواہش پوری کر رہے ہیں۔ جدید اکنامکس اسی انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے' لہٰذا اکنامکس میں

انسان' انسان نہیں Homoeconomicus کہلاتا ہے' ایک افادی' حسی' تجربی' لذت پرست وجود۔ اکنامکس انسان کو طالبِ لذات جانور قرار دیتی ہے(Man is a pleasure seeking animal)۔ ظاہر ہے طالبِ لذات وہی کام کرے گا جو منے میاں کر رہے ہیں' لہٰذا جدیدیت کا مسئلہ نفس مطمئنہ سے کامل محرومی ہے۔

چوتھی کتاب کی کہانی کا عنوان ہے Look Out۔ عالی شان گھر ہے' جس میں شان دار موٹر سائیکل بچوں والی کھڑی ہے۔ گھر کے اندر صحن چمن ہے' بہترین چمکتی دمکتی گاڑی کھڑی ہے۔ گھاس میں منے میاں موٹر سائیکل چلانے کی تیاری کر رہے ہیں' سر پر ہیلمٹ باندھ رہے ہیں۔ امی گھاس کاٹنے کی مشین سے گھاس کاٹ رہی ہیں۔ منے میاں موٹر سائیکل چلاتے ہیں تو کئی گملوں کو گرا دیتے ہیں۔ شور دھواں پھیل رہا ہے۔ کتا بھاگا ہوا آ رہا ہے' بلّی خوف زدہ ہے آواز سے۔ امی نے ہاتھ میں دستانے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ باغ بانی (gardening) میں مصروف ہیں' مگر چیخ رہی ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو منے! امی نے پتلون قمیض پہن رکھی ہے..... اسلام نے کب منع کیا ہے کہ عورت مرد جیسے کپڑے نہ پہنے؟..... اور ویسے بھی دنیا کو سب سے پہلے عورت مرد کی مساوات کا سبق تو اسلام نے ہی دیا ہے اس طرح کے کپڑے پہن کر ہی عورت کو آزادی کا احساس ہوتا ہے..... بہن خیمے میں بیٹھی ہے' خیمے کے اوپر تار پر بہن کے کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں۔ منے میاں غلط موٹر سائیکل چلاتے ہیں۔ خیمے کی میخ نکل جاتی ہے' کپڑوں کا تار منے کی گردن میں — تمام کپڑے گر جاتے ہیں۔ بہن چیختی ہے' منے میاں گھر میں گھس جاتے ہیں۔ پھلوں کی الماری' دوات کی بوتلیں' رنگ' منظر نامے (scenery) سب گرا دیتے ہیں۔ کمرے کا حشر نشر ہو جاتا ہے۔ ابا امی حیرانی سے دیکھتے ہیں مگر چپ ہیں۔ ڈبل روٹی اِدھر اُدھر اڑ کر گر رہی ہے۔ آخر کار امی آ جاتی ہیں' راستہ بناتی ہیں' گملے رکھتی ہیں' سڑک کا منظر پیش کر دیتی ہیں۔ ایک بچے کے ہاتھ میں ''رکو'' (Stop) کا گتہ دیتی ہیں۔ ایک بچی کے ہاتھ میں ''بچو رک جاؤ'' (Stop Children) کا پلے کارڈ ہے۔ کتا نگرانی کر رہا ہے۔ راستے بن گئے ہیں' ٹریفک کا نظام قائم ہو گیا ہے' مُنّے میاں مہذب (civilized) ہو گئے ہیں' اب وہ طے شدہ راستے پر سفر کریں گے' ان شاء اللہ نقصان نہیں ہوگا۔ نظم و ضبط تو اسلام بھی سِکھاتا ہے..... مغرب نے یہ سب کچھ اسلام سے لیا ہے..... اسلام کی میراث ہم آکسفرڈ کی کتابوں کے ذریعے مسلمانوں کو منتقل کر رہے ہیں' اس میں کیا ہرج ہے؟

پانچویں کتاب کا نام ہے Fun at the Beach۔ سرورق پر ایک عورت نیکر پہنے بچی کے ساتھ ساحل سمندر کی سیر کر رہی ہے۔ منے میاں' ابا امی' بہن بھائی کُتّے کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ایک آدمی تماشہ دِکھا رہا ہے۔ آئینے کے اندر امی ابا کی شکل بدل گئی ہے۔ آئینوں میں کُتّے' امی ابا' بچے عجیب و غریب نظر آ رہے ہیں' سب کا حلیہ خراب ہو گیا ہے۔ کتا بھی بالکل ٹیڑھا پتلا باؤلا لگ رہا ہے۔ بچے کھیلوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ابا کُتّے کو پکڑے کھڑے ہیں۔ اب کُتّے کو کُتّوں کے مخصوص علاقے (Dog Area) میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ واپس جاتے ہوئے ابو کُتّے کو لینے آئے تو وہ اتنی زور سے اچھلا کہ ہر طرف مٹی اڑنے لگی۔ بچے کہہ رہے ہیں: Oh Floppy ہر کہانی کا مقصد لطف' مزہ' ہنسی' مذاق' enjoyment ہے' کیونکہ یہی زندگی ہے' جان ہے تو جہان ہے۔ یہی پیغام ہے — اسی لیے تعلیم بھی اب کھیل تماشا بنا دی گئی ہے' Fun to learn اسی کا نام ہے۔ جس زندگی کا آغاز

لہوولعب سے ہواس زندگی میں سنجیدگی‘ تحمل اور دینی اقدار‘ مذہبی مزاج‘ نبوی طریقے کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ لہٰذا لہوولعب کی دینی تعبیر وتفسیر عام ہورہی ہے۔

تصویری کہانی ہے At School ۔ منے کی امی روتے دھوتے منے کو اسکول کے پہلے دن کھینچتے ہوئے اسکول میں زبردستی لے جارہی ہے۔ منے نے اسکول کے جنگلے کا کونا پکڑ لیا ہے‘ وہ اندر نہیں جانا چاہتا‘ ماں زبردستی کھینچ رہی ہے‘ وہ رو رہا ہے۔ بچے کھڑکی سے منے کو دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ ٹیچر بھالو لے کر منے کو بہلا رہی ہے‘ پچکار رہی ہے۔ آخر کار ماں زبردستی بچے کو اندر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ یہ عجیب ماں ہے جو بچے کو گود میں اٹھانے کے بجائے کھینچا تانی کررہی ہے۔ محبت تو اس عمل سے ظاہر نہیں ہے۔ منے میاں اندر جاکر بہت خوف زدہ ہیں۔ بچے اور ٹیچر انہیں محبت سے کھلونے دِکھاتے ہیں۔ آخر کار لالچ میں منے میاں کلاس میں آجاتے ہیں۔ وہاں بچے عجیب عجیب کام کررہے ہیں۔ کلاس زبردست ہے‘ کچھ بچے میز کرسی پر بیٹھ کر چھری چاقو کانٹے سے کھا رہے ہیں‘ کچھ استری کررہے ہیں‘ کچھ پکا رہے ہیں‘ کچھ کھیل رہے ہیں۔ ہر طرف سامان ہی سامان ہے۔ منے میاں بھی کھیل کے طلسم خانے میں گُم ہوجاتے ہیں‘ وہ بھی کچھ پکانے لگتے ہیں۔ اتنے مزے! ارے یہ تو اسکول نہیں ہے‘ یہ تو گھر میں کھیلوں کا کمرہ ہے۔ منے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اسکول کا وقت ختم ہوجاتا ہے‘ امی منے کو لینے آتی ہیں‘ منے میاں گھر جانے پر آمادہ نہیں۔ ٹیچر خدا حافظ کہہ رہی ہیں‘ منے میاں رو رہے ہیں‘ جنگلہ پکڑ کر زور لگا رہے ہیں‘ امی کھینچ تان کررہی ہیں۔ پہلے اسکول جانے پر راضی نہیں تھے‘ اب اسکول سے آنے پر راضی نہیں ہیں۔ امی پہلے بھی منے کو کھینچ رہی تھیں اب بھی کھینچ رہی ہیں۔ ماں کی ممتا سے محروم ایک کریہہ وجود ہے جو بچے سے زور آزمائی کررہا ہے۔ اسے گود میں اٹھاؤ‘ پیار کرو۔ اسے اسکول کے جبر سے آزاد کرو! اتنے چھوٹے بچے کو اتنی کم عمر میں اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے یہ مشورہ عصر حاضر کے انسان کے لیے نامعقول‘ احمقانہ‘ ظالمانہ ہوگا‘ کیونکہ اس کی عقلیت نے اس جبر کو بہ رضا ورغبت قبول کرلیا ہے۔ عہدِ حاضر کے لوگ پابندی‘ جبر‘ تسلط‘ کو سخت ناپسند کرتے ہیں‘ لہٰذا جبر کوئی بھی ہو اسے ناپسند کیا جائے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں کے لیے فریڈم کا جبر قابلِ قبول ہے۔ اسی لیے تو دوسال کے روتے ہوئے بچے کو بستر سے کھینچ کر مارتے‘ پیٹتے‘ ڈانٹتے ڈپٹتے چیختے چلاتے‘ شور مچاتے ہوئے دھکے دے کر بغیر ناشتے کے ایک گاڑی میں جبراً بٹھا کر صبح سویرے قید خانے بھیج دیا جاتا ہے اور اس پر تمام مہذب انسان فخر کرتے ہیں۔ تاریخ کے کسی معاشرے میں ایسا بدترین جبر کبھی نہیں ہوا‘ نہ مذہب کے دور میں‘ نہ بادشاہت کے دور میں‘ نہ فلاسفہ کے دور میں۔ یہ سرمایہ داری کا جبر ہے جو آزادی کے نام پر نہ صرف مسلط ہوا بلکہ تہِ دل سے تمام اقوام عالم‘ ملتوں اور امتوں نے مشترکہ طور پر قبول کرلیا اور اس کی مذہبی دلیلیں بھی ایجاد کرلی گئیں۔ لبرل ازم کے عقیدوں کے عین مطابق جو جبر انسان مرضی سے قبول کرلیتا ہے اسے لبرل ازم میں آزادی کہا جاتا ہے‘ جو مرضی سے قبول نہیں کرتا اسے جبر کے ذریعے آزادی قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ جبر لبرل ازم میں عین عدل کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جبر کو اپنی مرضی اور آزادی سے لیکن تعقل مذہبی (Religious rationality) کی بنیاد پر قبول کرتا ہے تو ایسی آزادی کو لبرل ازم میں آزادی نہیں پابندی‘ جہالت‘ ضلالت‘ گمراہی اور بدترین ظلم قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جدید مغربی فلسفے (ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن

ازم) کے مطابق ہر عاقل انسان آزادی ہی پسند کرتا ہے' کسی قسم کی خارجی (external) پابندی پسند نہیں کرتا۔ مذہب کی پابندیاں آسمان سے آتی ہیں اور انسانی آزادی میں کمی کر دیتی ہیں۔ کانٹ نے انسان کی تعریف یہی کی ہے کہ جو کسی خارجی ذریعے سے' وحی الٰہی سے' کسی عالمِ دین سے' علمِ ہدایت روشنی نہیں لیتا' تمام فیصلے عقلیت کی بنیاد پر کرتا ہے۔ ہدایت کے لیے انسان اپنے سے باہر' خارج کی طرف نہیں دیکھتا' بلکہ اپنے اندر جھانکتا اور عقل سے رجوع کرتا ہے' کیونکہ انسان علم' روشنی' ہدایت میں خود کفیل ہے' اسے کسی سے روشنی لینے کی ضرورت نہیں۔ تفصیلات کے لیے انٹرنیٹ پر کانٹ کا مضمون What is enlightenment کا مطالعہ کیجیے' اور اس کی تشریح فوکالٹ کے قلم سے پڑھیے۔ فوکالٹ کا مضمون What is enlightenment کے نام سے نیٹ پر موجود ہے۔

جدیدیت کا عقیدہ ہے ''آزادی کے عقیدے پر ایمان لاؤ کہ عقیدہ دلیل سے ماورا ہوتا ہے''۔ Believe in Freedom..... اس بارے میں کسی سوال اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ جو اس کا انکار کرے گا اس کے خلاف NATO' UNO' USA سب مل کر حملہ کریں گے۔ آزادی take for granted ہے' یہ بدیہی' آفاقی سچائی ہے۔ اس کی کوئی عقلی دلیل نہیں' یہ دلیل کا نہیں ایمان کا معاملہ ہے' آزادی کے عقیدے پر سب کو ایمان لانا ہوگا۔ جو آزادی کے عقیدے کا انکار کرے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy جمہوریت کے ذریعے آزادی کے عقیدے کے تسلط کے لیے دنیا بھر میں ہونے والے جمہوری قتل عام کی داستان بیان کرتی ہے۔ جمہوریت پرامن طریقے سے نہیں آئی' یہ قتل عام کے بعد مسلط ہوئی ہے۔ اسی آزادی کے لیے امریکیوں نے دس کروڑ ریڈ انڈینز کو قتل کیا۔ تفصیلات اسی کتاب میں پڑھیے۔ ظاہر ہے جب جمہوریت کے تمام مخالفین کو قتل کر دیا گیا تو دنیا پرامن ہوگئی۔ لہٰذا اب جمہوریت پرامن طریقے سے آتی ہے اور دنیا کو بتایا جاتا ہے کہ جمہوریت ہی پرامن تبدیلی کا واحد راستہ ہے۔ الجزائر' ترکی' بنگلہ دیش' مصر' ہر جگہ پرامن طریقے سے جمہوریت آرہی ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں جمہوریت کی خونی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی۔ عالم اسلام میں جمہوریت کو اسلام سے برآمد کر لیا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے جمہوری وزیراعظم ثابت کیے جاتے ہیں' جبکہ اس جمہوریت میں نہ کسی کو الیکشن لڑنے کی اجازت تھی نہ الیکشن مہم چلانے کی۔ نہ ووٹر لسٹ تھی نہ چیف الیکشن کمشنر۔ اس عظیم جمہوری الیکشن کا نتیجہ ووٹنگ سے پہلے سنا دیا گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہیں اور نتیجہ سنانے کے بعد سب بیعت کرنے یعنی ووٹ ڈالنے آگئے اور کئی مہینوں تک بیعت کر کر کے ووٹ ڈالتے رہے۔ ووٹ خفیہ ہوتا ہے۔ یہ عجیب ووٹ ہے جو خفیہ نہیں اور ایک شخص کو حاکم منتخب کرنے کے بعد ڈلوایا جا رہا ہے۔ اسلامی جمہوریت کی یہ شکلیں اسکولوں میں پڑھائی جا رہی ہیں۔

لبرل ازم کے عظیم سیاسی فلسفی جان رالز کا شارح Derben لکھتا ہے کہ جو شخص آزادیٔ جمہوریت کی عقلی دلیل طلب کرتا ہے ایسے جاہل شخص کو کوئی جواب نہ دو' اسے گولی مار دو..... ان موضوعات پر دلیل دینے کی' بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب **الحق' الخیر' العلم** ہیں' یہ بدیہی حقیقتیں ہیں جو کسی دلیل کی محتاج (taken for granted) نہیں۔ یہ self evident evidence ہیں۔

What Rawls is saying is that there is in aconstitutional liberal

democracy a tradition ofthought which it is our job to explore and see whether it can be made coherent and consistent... We are not arguing for such a society. We take forgranted that today only a fool would not want to live in such a soceiety... If one cannot see the benefits of living in a liberal constitutional democracy, if one does not see the virtue of that ideal, then I do not know how to convinceh im.Tboe perfedt ybl untnsometimes I am asked,when I go around speaking for Rawls,what do you say to an Adolf Hitler? the answer is (nothing) You shoot him. You do not try to reason with him. Reason has no bearing on this question. So I do not want to discuss it

[Derben, On Rawls & Political Liberalism, 2003: 328-329]

اصلاً ہم بچے کو ایک ماہ کی عمر میں ڈے کیئر سینٹر اور ڈیڑھ سال کی عمر میں اسکول کے سپرد کر کے اس کی آزادی سلب کر رہے ہیں' لیکن اپنی آزادی میں اضافہ کر رہے ہیں کہ عصر حاضر کی ماں سے بچے کا بوجھ نہ اٹھایا جاتا ہے' نہ اس کا شور گھر میں دن بھر برداشت کیا جاسکتا ہے۔ بچے' ماں اور گھر والوں کی آزادی کا تقاضا یہی ہے کہ بچے کو ڈے کیئر سینٹر یا اسکول بھیج کر آزاد کر دیا جائے۔ جس معاشرے میں ڈے کیئر سینٹر کھلتے ہیں اسی معاشرے میں اولڈ ہوم بھی کھولنے پڑتے ہیں۔ جب ماں باپ کے پاس بچے کے لیے وقت نہیں ہے' انہیں سرمایہ اور آزادی چاہیے تو بچے کے پاس بھی آپ کے بڑھاپے میں آپ کی خدمت کے لیے وقت نہیں ہے' اسے بھی سرمایہ اور آزادی چاہیے۔ یقیناً ڈے کیئر سینٹر' اسکول' اولڈ ہوم ہماری آزادی میں بے پناہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن کیا ہمیں آزادی کی منحوس شکلیں قبول ہیں؟ ہماری اسلامی تاریخ میں اور دنیا کی تئیس بڑی تہذیبوں میں یہ تینوں ادارے کیا موجود تھے؟ بلکہ ان تہذیبوں میں ہسپتال' جیل خانے' ہوٹل' ریسٹورینٹ' پاگل خانے' زچہ خانے' بھی نہیں تھے' تو سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں تھے؟ ہابیل' قابیل' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میٹرنٹی ہوم کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اہرامِ مصر' دمشق کی اموی مسجد' تاج محل' قرطبہ' عاد و ثمود' مصر' روم' یونان' ایران' چین' ہندوستان اور بابل و نینوا کے عجائبات تعمیر کرنے والے اسکول' کالج' انجینئرنگ یونیورسٹی' آرٹ اسکول کے بغیر یہ کمالات کیسے تخلیق کرتے تھے؟ کم از کم ان سوالات پر غور کی ضرورت تو ہے۔

اللہ کی عبادت کا بچے کو سات سال کی عمر میں حکم دیا جاتا ہے' جبکہ مادّہ پرستی' ترقی' مال و دولت کی عبادت اس پر ایک سال کی عمر سے پہلے فرض ہو جاتی ہے۔ اس کا نام آزادی ہے۔ ایک جانب مغرب تنوع کی بات کرتا ہے' دوسری جانب اسکول میں خاص قسم کا لباس پہنا کر تنوع ختم کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کے گھر میں عبادت کے لیے آنے والوں کے لیے لباس کی کوئی خاص شکل یا رنگ مخصوص نہیں کیا گیا' مگر اسکول میں خاص لباس کے بغیر داخلہ ممنوع ہے۔ اسے آزادی کہتے ہیں' یعنی حصول آزادی کے لیے پابندی کا سخت ترین نظام۔ بہت سے ملکوں میں تعلیم لازمی ہے' اس کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی۔ دوسرے معنوں میں لوگوں کو آزادی' سرمایہ داری' لبرل ازم' سیکولرازم کا جبر نظر نہیں آتا' اسلام کا جبر سب کو نظر آجاتا ہے۔ آزادی کا ہر جبر جائز قانونی اور حقیقی ہے' مذہب کا

تھوڑا سا جبر بھی ناجائز' غیر قانونی ہے۔ اسکول آزادی اور سرمایہ کا جبر ہے۔ (School is the tyrany of freedom & Capital) ..... یہ جبر عین حق ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ تعلیم اور عورتوں کی تعلیم پر اس قدر زور کیوں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ عورت کو مرد کے برابر لانے بلکہ مرد جیسا بنانے کا فائدہ کسے ہے اور کیسے ہے؟ تعلیم عام کرنے کے لیے مغربی ممالک اربوں کھربوں روپے کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ UNO تعلیم عام کرنے کے لیے Marriage Free Zone تو بنا رہے ہیں' لیکن Rape Free Zone کیوں نہیں بنا رہے؟ ان سوالوں کا جواب اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی John Rawls نے اپنی آخری کتاب میں کس خوبصورتی سے دیا ہے:

China have imposed harsh restrictions on the size of faimlies & have adopted other draconian measurs but there is no need to be so harsh. Instructive here is the Indian state of Kerala, which in the late 1970s empowered women to vote & to participate in politics to receieve & use education & to own & manage wealth & property. As a result, within several years Kerala's birth rate fell below China's without invoking the corecive powers of the state. China's birth rate in 1979 was 2.8 , Kerala's 3.0. In 1991 these rates were 2.0 & 1.8 respectively. [John Rawls., The Law of People with the Idea of Public Reason Revisited, Harvard University Press, USA. 2003, p. 110]

چھٹی کتاب کا نام ہے A Good Trick ۔ بہت بڑے ڈبّے سے غالیچہ (A- rug) نکالا جا رہا ہے' بچے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ غالیچے کے نیچے سفید چادر (A sheet) ہے' اسے اتارا گیا' اس کے اندر سے بڑا ڈبہ (A big box) نکلا' اب عورت مرد اس ڈبے کو اوپر اٹھاتے ہیں' اس کے اندر سے ایک چھوٹا ڈبہ (A little box) نکلتا ہے۔ اب عورت مرد پوچھتے ہیں بتاؤ اس کے اندر کیا ہے؟ ڈبہ کھلتا ہے' اس کے اندر سے مسکراتا ہوا بچہ نکلتا ہے جس کا نام ہے Kipper ۔ یہ ہے ترکیب (Trick)۔ پری نرسری کے بچے کو کرتب اور شعبدے بتائے جا رہے ہیں' مگر کیوں؟ کیا وہ حقیقت اور شعبدے میں فرق کر سکتا ہے؟

اور اب ساتویں مگر آخری کتاب پڑھئے Six in a Bed ۔ امی ابو بستر میں لیٹے ہوئے رسالہ اور کتاب پڑھ رہے ہیں۔ کمرہ نہایت شاندار' مسہری زبردست' اس پر چار موٹے موٹے نرم نرم تکیے۔ امی ابو کے سرہانے ٹیبل لیمپ دیوار میں نصب ہیں الگ الگ' تاکہ روشنی کتابوں پر آئے۔ چھوٹا بچہ بھی کتاب لے آتا ہے' کمرے کے کونے پر کھڑا ہو کر جھانکتا ہے' امی ابو اسے دیکھتے ہیں تو اپنے بستر پر بلا لیتے ہیں' وہ دونوں کے بیچ میں بیٹھ جاتا ہے' اپنی کتاب پڑھنے لگتا ہے۔ امی ابو اپنی کتاب اور رسالہ رکھ کر اس کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں۔ بڑا بھائی بھی اپنا کھلونا لے کر امی ابو کے کمرے میں جھانکتا ہے' دونوں اسے بھی بلا لیتے ہیں' وہ بھی مسہری پر چڑھ جاتا ہے' اپنا بھالوا بابا کے پاس رکھ دیتا ہے اور چھوٹے بھائی کی کتاب میں دلچسپی لیتا ہے' اشارہ کرتا ہے۔ بڑی بہن بھی اپنا بھالو لے کر پہنچ جاتی ہے' امی ابا اسے دیکھتے ہیں تو اسے بھی بستر پر بلا لیتے ہیں' وہ اپنی امی کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے'

بھالو رکھ دیتی ہے اور چھوٹے بھائی کی کتاب میں دلچسپی لیتی ہے۔ اب گھر کی آخری عظیم ہستی کُتّے صاحب بھی تشریف لے آتے ہیں' وہ تنہائی کا شِکار رہو گئے ہیں' لہٰذا وہ بھی دروازے سے جھانکتے ہیں' امی ابو ابھی غور کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں' وہ چھلانگ لگا کر مسہری پر چڑھتے ہیں' مسہری پہلے ہی وزن سے ڈانوا ڈول تھی' اب جو کُتّے کا وزن آیا تو مسہری کا توازن بگڑ گیا' ایک پایا ٹوٹ گیا' سب لوگ چیخ رہے ہیں' بھالو صاحب نیچے گر رہے ہیں' بہن بھی نیچے گر رہی ہے۔

ان کتابوں میں کس قسم کی معاشرت' کس قسم کا طرزِ زندگی بتایا گیا ہے؟ کتاب بچے کے لیے پری نرسری کی سطح پر آئیڈیل ہوتی ہے' کیوں کہ اس کی شخصیت بننے کے عمل میں ہوتی ہے۔ پڑھایا وہ جاتا ہے جو عالی' مثالی و معیاری (Superior, Ideal, Standrised) ہو — آپ کے دین' تاریخ' تہذیب' علمیت اور کلیت سے ہم آہنگ ہو۔ تو کیا یہ نصابی کتابیں اس معیار پر اترتی ہیں؟

آکسفرڈ کی یہ کتابیں ایک خاص طبقۂ اشرافیہ (EliteClass) کے طرزِ زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں' جس کا حصول ننانوے اعشاریہ ننانوے فی صد لوگوں کے لیے قیامت تک ناممکن ہے۔ آپ اعشاریہ ایک فی صد لوگوں کے طرزِ زندگی کو معیاری اور مثالی طرزِ زندگی کے طور پر پیش کر کے بچوں کو کس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں؟ دنیا کی طرف یا آخرت کی طرف؟ حقیقت کی طرف یا خواب کی طرف؟ مادّہ پرستی کی طرف یا خدا پرستی کی طرف؟ — جو بچہ اپنی کتابوں میں ایک خاص مادّہ پرستانہ' پُرتعیش' چھچھورے' غیر ذمہ دارانہ' غیر اخلاقی' احمقانہ' جاہلانہ طرزِ زندگی کو دیکھے گا کیا وہ اس سے مختلف طرزِ زندگی کو حیرت یا حقارت کے ساتھ نہیں دیکھے گا؟ وہ کتابوں میں بتائے گئے اس غیر حقیقی' ناممکن طرزِ زندگی کے حصول کا خواب بچپن سے دیکھے گا اور جب اسے پا نہ سکے گا تو یقیناً وہ خود کو محروم' مجبور' بے بس اور بے کس تصور کرے گا۔ جدید سیکولر نظامِ تعلیم اس طرزِ زندگی کے حصول کی آرزو اور جستجو کو زندگی کا اصل ہدف بناتا ہے۔ مختصراً اس نظام کا مقصد ناممکن کی جستجو ہے اور جو ممکن ہے اس نظامِ تعلیم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے — کیا ان کتابوں سے بچے کی مذہبیت' اخلاقیات' ارادوں' عزائم' خواہشات' میں بنیادی نوعیت کا تغیر واقع نہیں ہوگا؟

اس تجزیے کے ذریعے اس طریقے کو متعارف کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے ذریعے تمام اسلامی اسکولوں کے مخلص منتظمین' اساتذہ' مالکان' سرپرست اپنے نصاب کا ازسرِنو جائزہ لیں اور کسی مشترکہ نئے نصاب کے انتظار کے بجائے موجود و میسر نصاب میں فوری اصلاح کا آغاز کر دیں۔

جدید اسکول کا نظامِ تعلیم عقلیت' آزادی' لذت پرستی' افادہ پرستی' نتائجیت پرستی' حسیت پرستی' تجربیت اور حقوقِ طلبی (Rationalism/ Freedom/ Hedonism/ utalitarianism/ Pregmatism/ Emprialism/ Demand of Rights) کے عقائد کی تعلیم دیتا ہے اور اسی کے مطابق نسلِ نو کی تعلیم و تربیت کرتا ہے' لہٰذا ان اداروں سے نکلنے والا وجود صرف ایک مادی وجود ہوتا ہے' وہ نورانی' روحانی' ایمانی اور اخلاقی وجود نہیں ہوتا۔ اسی لیے جدیدیت کے منہاج میں انسانی نفس ایک آزاد' خودمختار' فاعلِ مطلق' حق خود ارادیت کا حامل ہے' جس کے تزکیہ نفس کا کوئی نظام کسی نظریے (لبرل ازم' نیشنل ازم' سوشلزم' ہیومن ازم' فاشزم'

فیمن ازم' انارکزم) میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

امرأالقیس کے بارے میں رسالت مآب ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ شاعر تو بہت اچھا ہے مگر قیامت کے دن جہنمیوں کا سردار ہوگا۔ رسالت مآب ﷺ کا فرمان یہ بتاتا ہے کہ آرٹ خواہ کس قدر قابل قدر ہی کیوں نہ ہو اگر وہ اخلاقی اقدار سے آزاد ہے تو اس کی اقدار تہذیب کے لیے تباہ کن ہوں گی' کیونکہ اخلاقیات سے آزاد ہونے کے بعد صالح زندگی تو درکنار انسانی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ امرأالقیس کی شاعری کی طرح جدید سیکولر تعلیمی نظام بھی بہت اچھا ہے' مگر اس نظام سے نکلنے والوں کی منزل جنت نہیں۔ یہ نظام جنت کی طرف رہنمائی کرنے سے قاصر ہے' کم ازکم یہ بات تو ہمیں تسلیم کر لینی چاہیے۔

سیکولر نظام تعلیم میں اسلامیات کا ایک پیریڈ پڑھانے' تجوید' ترجمے اور دعائیں یاد کرانے سے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آسکتی' کیونکہ جو ذہنی سانچہ اور فکری ڈھانچہ یہ نظام تعلیم تخلیق کرتا ہے اسے اسلام کی جزوی تعلیم سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ برطانیہ کے تمام تعلیمی اداروں میں انجیل کی تعلیم لازمی ہے' مگر وہاں کے اسکولوں اور معاشرے کی مجموعی اخلاقی صورت حال کیا ہے' یہ سب کے علم میں ہے۔ کچھ یہی حال عالم اسلام کے اسکولوں کا ہے۔

آزادی' مساوات اور ترقی کے عقیدے کے نتیجے میں تزکیۂ نفس' اخلاقیات' انسان کے باطن کی تعمیر' اس کی اصلاح' جدید لبرل سیکولر جمہوری غیر جمہوری ریاست کے اہداف میں شامل نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ امریکہ اور یورپ میں کیا نکلا؟ تمام نسلیں مجرم' بدکردار اور گناہوں میں گرفتار ہیں۔ اخلاقی طور پر ان کا جو حال ہے وہ وہائٹ ہاؤس سے صدر اوبامہ کی ہدایت پر جاری ہونے والی رپورٹ:Rape & Sexual Assualt A Reviewed Call to Action , Jan 2014 میں پڑھیے۔ یہ رپورٹ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت' سب سے زیادہ آزاد' تعلیم یافتہ' ترقی یافتہ قوم امریکہ کی بدترین حالت سے آگاہ کرتی ہے جو ہر پاکستانی کا آئیڈیل ملک ہے۔ یہ رپورٹ وہائٹ ہاؤس کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۲۲ ملین امریکی عورتوں اور دو ملین لڑکوں سے جبری بدکاری کی جاتی ہے' رضامندی سے ہونے والے کروڑوں زنا اس فہرست میں شامل نہیں۔ اسکول' یونیورسٹی اور کالج میں جبری زنا کی وارداتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ جبری زنا کرنے والے تمام مرد لڑکیوں کے جگری دوست' عشاق' ہم مشرب و ہم مسلک' قریبی رشتہ دار' اعتماد کے لوگ اور خونی رشتوں والے ہوتے ہیں۔ ان اداروں میں صرف عورت ہی نہیں مرد بھی محفوظ نہیں ہے' ان کی عزتیں بھی لوٹی جاتی ہیں۔ امریکی فوج میں عورتیں اور مرد بھی بڑے پیمانے پر جنسی درندگی کا شکار ہیں۔ رپورٹ میں سرحدوں کے ان محافظوں کی عزت کی حفاظت کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔ جو ملک اپنی فوج کی عورتوں کی عزت کی حفاظت نہیں کرسکتا وہ دنیا بھر کو آزادی کا سبق سنانے کے لیے نکلا ہوا ہے۔

Nearly 22 Million have been raped in their life time, 1.6 million men have been raped during their lives. [p.1]

رپورٹ بتاتی ہے کہ اسکول' کالج' یونیورسٹی میں نشانہ بننے والے صرف ۱۲ فی صد مظلوم جنسی دہشت گردی کی رپورٹ درج کراتے ہیں:

On average only 12% of students victims report the assault to law enforcement. [p.14]

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہر دوسری لڑکی جنسی درندگی کا شکار ہے۔ ترقی اور تعلیم کے لیے مغرب کی عورت کو یہ ظلم گوارا ہے۔ یہ اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ امریکی ثقافت جبری زنا کاری کی اجازت دیتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق امریکی ثقافت میں ابھی تک مرد یہ سمجھتے ہیں کہ عورت خود مرد سے جنسی تعلق قائم کرنا چاہتی ہے' یعنی عورت کو اسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

Sexual assault is perrasive because our culture still allows it to persist.[p.33] .... women want to be raped and ask for it. [p.27]

گویا تعلیم کے ذریعے ترقی کرنا ہے تو یہ تکالیف برداشت کرنا ہوں گی۔ آزادی کا حصول ان آلام' آزمائشوں' تکالیف کے بغیر ممکن نہیں۔ یوروپی یونین کا حال اس سے زیادہ بدتر ہے۔ FRA کی ویب سائٹ پر یوروپی یونین میں عورتوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی کے ہولناک اعداد وشمار دیے گئے ہیں۔ 53% عورتوں کو شکایت ہے کہ مرد انھیں گھر سے باہر' بازار میں' اسکول' کالج' یونیورسٹی' دفاتر میں غلیظ نگاہوں سے گھورتے رہتے ہیں' 38% عورتوں کے ساتھ کئی مرتبہ جبری زنا کاری کی گئی ہے' ۱۳ سال کی لڑکی سے لے کر ۷۳ سال تک کی عورت کو ای میل کے ذریعے فحش اور گندے پیغامات موصول ہوتے ہیں۔

یوروپین ایجنسی فار فنڈامینٹل رائٹس (FRA) نے یوروپی یونین کے ۲۸ ممالک میں عورتوں کی بے حرمتی' عزت' عصمت' عفت اور حرمت کی پامالی کی حیرت ناک' شرم ناک اور افسوس ناک کہانی تحقیق کی روشنی میں بیان کی ہے (Violence against women: an Eu -wide survey. Main results) رپورٹ کے مطابق ایک سال میں ایک کروڑ بیس لاکھ عورتوں کو جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ تشدد صرف جوان لڑکیوں پر نہیں پچھتر سال کی بوڑھی عورتوں پر بھی ہوا۔ یہ کیسی انسانیت ہے کہ بوڑھے لوگ بھی اس ظلم سے محفوظ نہیں۔

یوروپی یونین کے ۲۸ ممالک کی چار کروڑ عورتوں یعنی اٹھارہ فی صد عورتوں نے شکایت کی ہے کہ مرد انھیں گھورتے' تاکتے اور جھانکتے ہیں' ان کے گھر' دفتر اور تعلیم گاہوں کے باہر راستے میں یہ مرد ان کو حریصانہ اور مریضانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

An estimated 13 million women in the EU have experienced physical violence in the course of the 12 months before the survey interviews. This corresponds to 7% of women aged 18-74 years in the EU.

An estimated 3.7 million women in the EU have experienced sexual violence in the course of the 12 months. This corresponds to 2% of women aged 18-74 years in he EU.

One in 20 women (5%) has been raped since the age of 15. This figure is based on responses to the survey question Since you

were 15 years old until now how often has someone force you into sexual intercourse by holding you down or hurting you in some way?

In the EU-28 , 18% of women have experienced stalking since the age of 15 and 5% of women have experienced stalking. This corresponds to about 9 million women in the EU 28 experiencing stalking. To obtain this finding, women were asked in the survey interview whether they had been in a situation where the same person had been repeatedly offensive of threatening towards them with respect to a list of different actions, for example whether the same person has repeatedly Loitered or waited for you outside your homeworkplace or school without a legitimate reason? or Made offensive threatening or silent phone calls to you?

Forms of sexual cyberharassment since the age of 15 and in the 12 months before the survey, including unwanted sexually explicit emails or sms messgaes that were offensiv.

Some 12% of women indicate that they have experienced some form of sexual abuse or incident by an adult before the age of 15 which corresponds to about 21 million women in the EU. The results show that 30% of women who have experienced sexual victimisation by a former or current partner also experienced sexual violence in childhood. Of those women who have not experienced sexual victimisation in their current or former relationship 10 % indicate experiences of sexual violence in their childhood.

Half of all women in the EU (53%) avoid certain situations or places at least sometimes for fear of being physically or sexually assaulted in comparison existing surveys on crime victimisation and fear of crime show that far fewer men restrict their movement.

امریکہ اور یوروپ میں سب سے زیادہ جبری زنا تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ رضامندی سے ہونے والا زنا جرم نہیں' لہٰذا اس کے اعداد وشمار جمع نہیں کیے جاتے۔ تعلیم کا مقصد آزادی اور سرمایہ ہے جس کے ذریعے ترقی کا حصول ممکن ہے' لہٰذا ہر کوئی ترقی کے لیے یہ مظالم برداشت کرتا ہے۔ واضح رہے کہ امریکہ اور یورپ میں پولیس صرف تین منٹ میں موقع واردات پر پہنچتی ہے' تب زنا کاری کا یہ حال ہے۔ ان ملکوں میں جنسی درندگی کا یہ حال سو فی صد تعلیم عام ہونے کے بعد ہوا ہے۔ تعلیم سے تہذیب' اخلاق' ادب' شرافت پھیلتی ہے' یہی عام خیال ہے' لیکن عملاً کیا ہو رہا ہے؟ لامحدود ترقی ایک خواب ہے مگر ہر ایک یہ خواب دیکھ رہا ہے' اس خواب کے لیے

عورت مرد اپنی عزت تعلیم گاہوں میں قربان کرنے پر آمادہ ہیں۔لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اس محدود (finite) دنیا میں کیا لامحدود (infinite) ترقی ممکن بھی ہے؟ ایک محدود انسان جو کل مر جائے گا اتنی لامحدود ترقی کیوں چاہتا ہے؟ اور ترقی بھی اپنی عصمت، عزت اور حرمت کی قیمت پر!

Kenneth Bouding کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس محدود دنیا میں لامحدود ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے تو یا تو وہ پاگل ہے یا ماہر معاشیات۔

Any one who believes growth can be infinite in a finite world is either a mad man or an economist.

لیکن دنیا میں ایسے پاگلوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور تعلیمی نظام ہی ان کی پیداوار کا اصل مرکز ہے۔

جدید صنعتی غذائیں جو کیمیائی مادوں سے تیار کی جاتی ہیں اس کے استعمال کا نتیجہ مغرب میں یہ نکلا ہے کہ لڑکیوں اور لڑکوں کی بلوغت کی عمر سات سال کم ہوگئی ہے۔ پہلے جو لڑکی سترہ سال میں بالغ ہوتی تھی اب دس سال میں بالغ ہو رہی ہے۔ظاہر ہے اس سے مارکیٹ کو فائدہ ہے، صارفین یعنی خریداروں (consumers) کی تعداد بڑھ رہی ہے جس سے پیداوار (production) بڑھ رہی ہے اور کارپوریشن کا منافع (profit) بھی اندھا دھند بڑھ رہا ہے۔ بلوغت کی عمر اسی رفتار سے کم ہوتی رہی تو ہر پیدا ہونے والا بچہ بالغ پیدا ہوگا۔ یہ کیسا خطرناک جنسی بحران ہوگا؟ یہ بحران ترقی کی قیمت ہے؟ مغرب میں بلوغت کی عمر کم ہونے پر کسی کو تشویش نہیں۔

Today most doctors accept that the age of onset of puberty is dropping steadily.

Consider the statistics provided by German researchers. They found that in 1860, the average age of the onset of puberty in girls was 16.6 years. In 1920, it was 14.6; in1950, 13.1; 1980, 12.5; and in 2010, it had dropped to 10.5. Similar sets of figures have been reported for boys, albeit with a delay of around a year.[The Observer, Sunday 21 October 2012]

آزادی، اعلیٰ تعلیم، زبردست سائنسی معاشی ترقی کرنے والے امریکہ میں روزانہ ۸۵ لوگ خودکشی کرتے ہیں، یعنی ہر سترہ منٹ کے بعد ایک امریکی خودکشی کرتا ہے۔ یہ اعداد و شمار نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ (NIMH) امریکہ کے ہیں اور نصابی کتاب Abnormal Psychology میں شامل ہیں۔

About 31000 people kill themselves each year in USA which averages to nearly 85 poeple per day or one person every 17 minutes. [Susan Nolen Hoeksema , Abnormal Psychology, McG Raw - Hill USA 2004, p.332]

امریکہ میں پچاس فی صد نوجوان اپنے اردگرد خودکشی کی کوشش کے کسی نہ کسی واقعے سے واقف ہوتے ہیں۔یعنی خودکشی امریکہ میں زندگی کے معمولات کا حصہ ہے۔امریکہ میں ہر چار میں سے ایک نوجوان خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ پندرہ سال سے ۲۴ سال کے امریکیوں میں موت کا تیسرا بڑا سبب خودکشی ہے۔امریکہ کے تین

فی صد لوگ زندگی میں کبھی نہ کبھی خودکشی کی کوشش کرتے ہیں' اور امریکہ کی پانچ سے لے کر سولہ فی صد آبادی زندگی میں کبھی نہ کبھی خودکشی کے بارے میں سوچتی ہے۔ مسئلہ صرف امریکہ کا نہیں' جدیدیت' مغربیت' سیکولر تعلیم' آزادی' مساوات' ترقی کا عقیدہ جن ملکوں میں جڑ پکڑ چکا ہے وہاں خودکشی کی رفتار یہی ہے۔ اس ترقی یافتہ' جدید' حسین' آرام دہ دنیا میں سالانہ دس لاکھ لوگ خودکشی کے ذریعے مرجاتے ہیں' بیس لاکھ لوگ خودکشی کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ انسانی کی تیئیس تہذیبوں میں کبھی ایسی صورت حال پیدا نہ ہوئی۔ ایسی ترقی' ایسی سائنس' ایسی ٹیکنالوجی' ایسی آزادی' مساوات اور جمہوریت کو لے کر کیا کریں جو لوگوں سے زندگی کی امنگ' لگن اور ترنگ تک چھین رہی ہے! امریکہ سمیت تمام ترقی یافتہ ملکوں میں آزادی' مساوات' ترقی حاصل کرنے والی جدید عورت' جو خود کو تاریخ انسانی کی سب سے زیادہ آزاد اور خوش نصیب عورت سمجھتی ہے' سب سے زیادہ خودکشی کرتی ہے۔ مذہبی' تنگ نظر' اندھے' بہرے' گونگے' الہامی' دینی' روایتی' اَن پڑھ' جاہل معاشروں میں کبھی عورت نے خودکشی نہیں کی تو کیوں؟ آزاد' تعلیم یافتہ' خوش حال عورت خودکشی کیوں کر رہی ہے؟ گزشتہ ساٹھ سال میں خودکشی میں اضافے کی شرح عام لوگوں میں بہت کم رفتار سے بڑھی ہے' لیکن بچوں اور نابالغوں میں خودکشی کی شرح میں تین سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ نوبالغوں میں بچوں اور بالغوں سے زیادہ خودکشی کا رجحان ہے۔ کالج میں پڑھنے والے طلبہ میں خودکشی کی شرح سب سے زیادہ ہے' وہ داخلہ لیتے ہی خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ تعلیم ترقی کا زینہ ہے مگر موت کا کنواں بھی ہے' اسی لیے امریکہ میں کالجوں میں داخلہ لینے والے نوفی صد طلبہ خودکشی کو ترقی اور تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں۔ سنہرے مستقبل کی امید مگر امتحان میں ناکامی ان کے خواب بکھیر دیتی ہے۔ زندگی کا مقصد ترقی ہے' ناکامی کے بعد ترقی کیسے حاصل ہوگی؟ کالجوں کے ایک فی صد طلبہ خودکشی کی کوشش کرتے ہیں۔ ۴۴ فی صد بوڑھے لوگوں کی خودکشی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان سے دور اولڈ ہوم میں تنہا زندگی پسند نہیں کرتے' وہ تنہائی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

Nearly half of all teenagers in the USA say that they know someone who has tried to commit sucide. [p.330, ibid] One in four teenagers admits to attempting or seriously contemplating suicide. [p.330, ibid] Suicide the third leading cause among people 15 to 24 years of Age. [p.330, ibid] 3 Percent of the population contemplate sucide at sometime in their lives, & between 5 & 16 percentreport having had suicidal thoughts at sometime. [p.332, ibid] 1 million people die by suicide and 2 million other people make suicide attempts each years [p.332, ibid] Rates of suicide in women would be much higher than in man. Indeed three times more women than men attempt to suicide. [p. 333, ibid] The over all rate of suicide in the general population has slightly increased over the past 60 years but the rate among children & adolescents has sky rocketed by nearly

300 percent. [p. 334, ibid] Young adults are more likely than adults of any other age to think about commiting suicide. [p. 334, ibid] Students in colleges 9 percent said thay had thought about committing suicide since entering college and 1 percent said they had attempted suicide while at college. [p. 336, ibid] 44 percent older people who committed suicide had said they could not bear being placed in a nursing home and would rather be dead. [p. 336,ibid]

مغرب میں جنسی دہشت گردی اور خودکشی کی بدترین صورت حال جدید تعلیم اور ترقی کے ایجنڈے کا لازمی نتیجہ ہے۔ پاکستان کے شہروں میں بھی اسی صورت حال کا سامنا ہے۔ جدید اسکولوں اور معاشرے میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر ہم نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ مغرب کی پیروی کا یہی انجام ہے۔ ایدھی ٹرسٹ کے جھولوں میں حرامی بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کس خطرے کی علامت ہے؟ ایک جانب بچے پھینکے جا رہے ہیں' دوسری جانب اخبارات میں بچہ پیدا کرنے والے ہسپتالوں کے اشتہار چھپ رہے ہیں' ٹی وی کے پروگراموں میں بے اولاد امیر جوڑوں کو بچے بانٹے جا رہے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ یہ سب کیا تماشہ ہے؟ ایک جانب شادی والوں کے بچے پیدا نہیں ہو رہے' دوسری جانب شادی کے بغیر بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ سب ماس میڈیا اور ماس ایجوکیشن (Mass Education) کا نتیجہ ہے۔

دنیا بھر میں ابلاغِ عامہ (Mass Media) سے پروپیگنڈے کے ذریعے دیہی زندگی حقیر بنا دی گئی ہے۔ اس حقیر' ذلیل زندگی سے چھٹکارے کا راستہ تعلیم ہے۔ تعلیم عام ہونے کے نتیجے میں دیہات سے شہروں تک بڑے پیمانے پر نقل مکانی (Mass Migration) ہو رہی ہے۔ ۲۰۱۵ء تک دنیا کی ساٹھ فیصد آبادی شہروں میں ہوگی' دیہاتوں کی زمینوں اور کاروبار پر ملٹی نیشنل کارپوریشنز کا قبضہ ہوگا۔ تعلیم عام (Mass education) ہونے کے بعد چھوٹے کاروبار' ذاتی تجارت' خاندانی ہنر' نسل در نسل چلے آنے والے آبائی فنون' دستکاری' گھریلو صنعتیں' خاندانی زراعت وغیرہ سب ختم ہو جائیں گے' کیونکہ لوگ ان پیشوں' صنعتوں' کاموں کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ آج کل دیہاتوں میں ریوڑ چرانے والے دستیاب نہیں ہیں۔ یہ کام بچے کرتے تھے' ان کو چائلڈ لیبر کہا گیا اور ترقی کے لیے تعلیم کے سپرد کر دیا گیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کم ہو گئے ہیں' سب شہر جا کر ترقی کرنا چاہتے ہیں' انھیں میڈیا اور تعلیم کے ذریعے یقین دلا دیا گیا ہے کہ وہ غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ترقی کی اصطلاح دنیا کی کسی تہذیب میں موجود نہ تھی۔ مغربی استعمار کی اس اصطلاح کا اصل مطلب کیا ہے' اس کے لیے Development Dictionary کا مطالعہ کیجیے۔ ترقی کے نتیجے میں لوگ اپنے آبائی علاقوں' تاریخ' تہذیب' آبائی پیشوں' خاندان سے کٹ کر اداروں کے غلام بن رہے ہیں' سرمایہ دارانہ نظام کو سستے مزدور مل رہے ہیں۔ جب عورتیں بھی تعلیم پا کر مردوں کے شانہ بشانہ ہوں گی تو کارپوریشن کو مزید سستے مزدور ملیں گے۔ شہروں کے اندر روایتی اجتماعیتیں بڑے پیمانے پر منتقلی (Mass Mobilization) کے باعث تتر بتر ہو رہی ہیں' اجتماعیت (collectivity) کی جگہ ہجوم (mass) نے لے لی ہے۔ انسان شہروں کی بھیڑ میں تنہا رہ گیا ہے' اپنی جڑ سے

کٹنے کے بعد وہ دیہاتوں کی طرف واپس جانے کے قابل نہیں رہا۔ اپنے ہی وطن میں اجنبی اس مسافر کا ماضی' حال اور مستقبل اس مریض ہجر کی طرح ہے جو امیدِ سحر سے محروم ہے۔ شہروں میں غیر فطری بے پناہ آبادی نے افقی عمارتوں کا ایک بے ہنگم جنگل کھڑا کر دیا ہے۔ معاشرتی' ثقافتی' روایتی تعلیمات ختم ہوگئی ہیں۔ کوئی کسی کو نہیں جانتا' لہٰذا تمام جدید بڑے شہر جرائم کے سب سے بڑے مراکز ہیں۔ جرائم اور مجرموں کے انسائیکلو پیڈیا چھپ رہے ہیں۔ بلاشبہ دنیا میں سب سے زیادہ بہترین تعلیم ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں ہے' سو فی صد لوگ تعلیم یافتہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں' لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض' سب سے زیادہ پاگل' سب سے زیادہ جنونی' وحشی' سب سے زیادہ بیمار' سب سے زیادہ طلاقیں' ٹوٹے ہوئے گھر' آوارہ نسلیں' سب سے زیادہ جنسی درندے' سب سے زیادہ مجرم' سب سے کم بچے' سب سے کم شادیاں' سب سے زیادہ ناکاری' سب سے زیادہ حرام رشتوں سے جنسی تعلقات (incest relation) ' سب سے زیادہ تنہائی' بے سکونی اور خودکشیاں' گھروں سے محروم سب سے زیادہ بوڑھے' بچے' عورتیں' انہی ترقی یافتہ ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

یورپ' امریکہ' روس' چین' لاطینی امریکہ' اسکینڈے نیوین ممالک یعنی دنیا کی تیس فی صد آبادی میں دنیا کے اسّی (۸۰) فی صد جرائم ہوتے ہیں۔ ستّر (۷۰) فی صد غیر ترقی یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ ممالک بہت کم مجرم پیدا کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر برطانیہ کے ہوم ڈپارٹمنٹ اور CIA کی ویب سائٹ پر اعداد و شمار دیکھے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اختتام پر امریکا میں نوے فیصد لوگ کسی نہ کسی ادارے میں نوکری کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ پہلے آزاد تھے یا اب آزاد ہیں؟

> *Under capitalism it is the unintended but non the eless unavoidable outcomes, witness the fact that in that home of 'free enterprise' the USA, ninety percent of the employed now work in organization of one kind or another, whereas at the beginning of the century ninety percent were self employed [GAI EATON; King of The Castle: Choice & Responsibility In Modern World, Suhail Academy, Lahore1981, P-24]*

پاکستان میں ابھی تک (۲۰۱۴ء میں) چھیاسی فیصد لوگ اپنا کاروبار کرتے ہیں' وہ اداروں میں ملازمت نہیں کرتے۔ صرف بارہ فی صد لوگ بینکوں میں کھاتے رکھتے ہیں' اٹھاسی فی صد لوگوں کا جدید معاشی بینکاری نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ پاکستان کی معیشت دنیا کی مضبوط ترین معیشت ہے' آزاد معیشت ہے' نہ برآمدات کی محتاج ہے نہ درآمدات کی' مگر اس کو تباہ کر کے امریکہ اور مغرب کی طرح تمام لوگوں کو عالمی سرمایہ دارانہ اداروں کا غلام بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پاکستان میں Macro اور Metro اس کا ثبوت ہیں۔ پھل والے' مچھلی' مرغی' سبزی والے اپنے کاروبار چھوڑ کر ان اداروں میں وہی کام کر رہے ہیں اور نوکری کا تحفظ نہیں ہے۔ امریکا میں ایسا ہی ہوا اور جدید مغربی دنیا میں یہ سب ہو چکا ہے۔ گائی ایٹن لکھتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں امریکا میں نوّے فیصد لوگ اپنا کام اور کاروبار کرتے تھے' وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ جدید تعلیمی نظام اس تبدیلی میں مرکزی کردار ادا کر رہا ہے۔

Gilbert Rist بتاتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی شہروں میں سال بھر میں ۱۵۰ دن کام نہیں ہوتا تھا' یعنی لوگ شہروں میں سال میں زیادہ سے زیادہ ۲۱۵ دن کام کرتے تھے۔ کام کے اوقات بھی مقرر نہیں ہوتے تھے' کام کے لیے میلوں دور بھی جانا نہیں پڑتا تھا۔ اب تو اوقات کا جبر بھی موجود ہے اور طویل مسافت بھی' مگر اسے آزادی سمجھا جاتا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں فرانس میں سرکوزی کی جانب سے ریٹائرمنٹ کی عمر دو سال بڑھانے پر بوڑھوں کی جانب سے زبردست احتجاج کا سبب اب واضح ہو گیا ہے۔ ماضی کے اچھے دنوں کی یاد ہی اس غصے کا اصل سبب ہے جب لوگ کم کام کرتے تھے۔ اب مسلسل کام کرتے ہیں' ایک لمحہ آرام نہیں کر سکتے' اس لیے مغربی دنیا میں لوگوں کے لیے سب سے بہترین اور خوشی کا دن جمعہ کا ہوتا ہے جب وہ دو دن کی چھٹی پر جاتے ہیں اور سب سے خراب دن پیر ہوتا ہے جب انھیں مجبوراً کام پر واپس آنا پڑتا ہے' لہٰذا کوئی مغربی ساٹھ سال کے بعد کام کرنے پر تیار نہیں۔ اس کے برعکس اگر پاکستان میں سرکاری ملازمین کی عمر دو سال نہیں دس سال بڑھا دی جائے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائیں گے۔ مگر مغرب ماضی کو قرون مظلمہ (Dark Ages) کہتا ہے۔ پاکستان ابھی تک انیسویں صدی کے امریکہ اور اٹھارہویں صدی کے فرانس کی طرح مضبوط معیشت کا ملک ہے۔ لوگ آزادانہ کاروبار کر رہے ہیں۔ آبادی کی اکثریت ملازمت یا روزگار کے لیے کمپنیوں' کارپوریشن' حکومت کی محتاج نہیں' سب اپنا کام کرتے ہیں۔ مگر پاکستانی خود کو کیا سمجھتے ہیں اور کیا بننا چاہتے ہیں' یہ سب کو معلوم ہے۔

اسکولوں کے بہت سے منتظمین' مالکان اور سرپرست یہ سوال کر سکتے ہیں کہ نصابِ تعلیم' نظامِ تعلیم' طریقہ تدریس و تربیت پر لکھے گئے مضمون میں سرمایہ داری' جمہوریت' لذت پرستی کا نظام' مذہب دشمنی' عقیدوں کی بحث' سیاست وغیرہ کہاں سے آ گئے؟ اس کا تعلیم و تربیت سے کیا تعلق؟ —— ظاہر ہے وہ افراد جنھوں نے معلّمی' تعلیم و تربیت کے پیشے' کاروبار اور شعبے کو نہایت نیک نیتی' اخلاص' اور قربانی کے جذبے کے تحت اختیار کیا ان کے لیے یہ سوالات اہم ہیں' مگر اس کے لیے ہمیں مغرب کے نظام تعلیم سے متعلق تین اہم تعلیمی فلسفوں کو دیکھنا ہوگا جو جدید تعلیم کی مابعد الطبیعیاتی اساسات فراہم کرتے ہیں:

- ☆ *The Platonic Philosophy of Education.*
- ☆ *The Individualism Philosophy of 18th Century Enlightenment.*
- ☆ *The Institutional Idealistic Philosophies of Nineteenth Century.*

جرمنی دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم تک قومی آفاقی لازمی تعلیمی نظام تشکیل دیا تھا۔ لہٰذا جرمنی کے نظامِ تعلیم کا مطالعہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اہم مغربی مفکرین کا مطالعہ بھی ضروری ہے تاکہ ان مباحث کی بنیادوں سے ہم واقف ہو سکیں۔ Kant کے خطبات Rousseau 'Treatise on Pedagogies کی کتاب Emile' Emile Durkheim کی کتاب Education & Sociology' Max Weber کا مضمون The Rationalization of Education & Training' John Dewey کا مقالہ The Democratic Conception in Education' فوکالٹ کی کتاب Dicipline & Punishment: The birth of the prison میں فوکالٹ کی تحریر جدید تعلیمی اداروں کی عمارتوں اور ان قید خانوں' عقوبت خانوں کے تربیتی نظام امتحانات پر

ہےاورنہایت اہمیت کی حامل ہے۔

مزید برآں Basil B. Bernstein کا معرکہ آراء مقالہ Thoughts on the Trivium and Quadrivium: The Divorce of Knowledge from the Knower اس مقالے کا ایک اقتباس ہمارے موقف کی تائید کرتا ہےاور جدید تعلیمی نظام کی حقیقت بھی واضح کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جدید سیکولر تعلیمی نظام میں فرد کے باطن کی اصلاح' تزکیۂ نفس' تعمیرِ شخصیت کا کوئی نظام ہی نہیں ہے' مذہب کو بے دخل کر دیا گیا ہےاور سوشل سائنس کے ذریعے فرد کی اصلاح کی جارہی ہے۔

I have tried to show that in the medieval period we had two differently specialised discourses, one for the construction of the inner, one for the construction of the outer_the material world. The construction of the inner was the guarantee for the construction of the outer. In this we can find the origin of the professions. Over the next five hundred yers there was a progressive replacement of the religious foundation of official knowledge by a humanising secular principle. I want to argue that we have, for the first time, a dehumanising principle, for the organisation and orientation of official knowledge. What we are seeing is the growing development of the specialised disciplines of the Quadrivium, and the diciplines of the Trivium have become the disciplines of symbolic control___the social sciences.

We know, however, how this special status in turn limited and distorted the knowledge, but this is not the point here. Today the market principle creates a new dislocation. Now we have two independent markets, one of knowledge and one of potential creators and users of knowledge.

❁❁❁

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 45 روپے اشاعت عام: 25 روپے

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : ششماہی ''التفسیر'' کراچی (شمارہ جنوری تا جون ۲۰۱۴ء)

مدیر اعلیٰ : پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج

ضخامت : 450 (اردو) + 17 (انگریزی) صفحات' قیمت: 700 روپے

ملنے کا پتا : پی او بکس 8413' جامعہ کراچی' کراچی 75270

''التفسیر'' جامعہ کراچی کا ششماہی مجلّہ ہے جو ہائر ایجوکیشن کمیشن سے منظور شدہ ہے۔ اس کی قومی مجلس مشاورت میں ڈاکٹر خالد مسعود (جج شریعہ اپیلیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان)' جسٹس ایس اے ربانی (سابق جج وفاقی شرعی عدالت اسلام آباد) کے علاوہ جامعہ کراچی کے متعدد پروفیسر صاحبان شامل ہیں۔ اس کی بین الاقوامی مجلس مشاورت میں جنوبی افریقہ' امریکہ' ترکی اور انڈیا کے معروف اہل علم شامل ہیں۔

زیر تبصرہ شمارہ ''التفسیر'' کی خصوصی اشاعت ہے جس میں پاک و ہند کے مشاہیر مفسّرین کے مختصر حالات اور ان کی تفاسیر کا جامع تعارف کرایا گیا ہے۔ ہر تفسیر کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن شخصیات کے تفسیری کام کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی' مولانا عبدالحق حقانی' مولانا احمد رضا خان بریلوی' مولانا شبیر احمد عثمانی' ابوالکلام آزاد' مولانا مفتی احمد یار خان نعیمی' مولانا محمد ادریس کاندھلوی' مفتی محمد شفیع' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' پیر محمد کرم علی شاہ اور علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہم شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری اور جماعت احمدیہ کے ماننے والے افراد کی تفسیری توضیحات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ توضیحات راسخ العلم علماء کے نزدیک صائب نہیں ہیں۔ مضمون نگار نے ڈاکٹر طاہر القادری کے چند تفردات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً عیسائی مسلمانوں کی مسجد میں عبادت کر سکتے ہیں اور کرسمس منا سکتے ہیں وغیرہ۔ انگریزی صفحات میں عصر حاضر کے معروف عالمِ دین مفتی محمد تقی عثمانی کا ذکر ہے۔ اُن کی اردو اور انگریزی میں تفاسیر قابل قدر ہیں۔ زیر تبصرہ مجلّہ کے مفسّرین میں علامہ مفتی تقی عثمانی اور ڈاکٹر طاہر القادری بقید حیات ہیں۔

یہ مجلّہ تفسیری معلومات کے حوالہ سے ایک جامع دستاویز ہے جو اساتذہ کے علاوہ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم کے لیے تشفی بخش مواد کا حامل ہے۔

(۲)

نام کتاب : مسئلہ تعلیم

مصنف : مولانا محمد ادریس کاندھلوی

ضخامت : ۴۴صفحات' قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ : مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار' لاہور

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کے ممتاز عالم دین تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے' جن میں سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم' مشکوٰۃ کی چھ جلدوں میں تشریح بزبان عربی' معارف القرآن (تفسیر قرآن) ممتاز ہیں۔ مولانا ۱۹۷۴ء میں فوت ہوگئے۔

مولانا کاندھلوی اس کتاب میں علم دین اور علم دنیا کی وضاحت کرتے ہیں۔ علم دین میں تو وہ علوم آتے ہیں جن میں آخرت کی زندگی سنوارنے کی تعلیم دی جاتی ہے جبکہ دنیوی علوم میں وہ علوم ہیں جن میں دنیوی ترقی کے حصول میں کسی جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ انگریزی ایک زبان ہے اور کسی زبان کو سیکھنا ممنوع نہیں۔ اگر انگریزی تعلیم اپنی دنیا سنوارنے کے لیے حاصل کی جائے اور اس کا دوسرا مقصد نہ ہو تو یہ درست نہیں۔ عمر' تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ انگریزی تعلیم سیکھ کر انسان مذہب سے دور ہو جاتا ہے' انگریزوں کی تہذیب کو پسند کرنے لگتا ہے' بلکہ دینی باتیں اسے اچھی نہیں لگتیں۔ اسلامی لٹریچر تمام تر عربی میں ہے' قرآن مجید عربی میں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی' چنانچہ ہر مسلمان کے لیے عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔

انگریزی چونکہ دُنیوی ترقی یافتہ لوگوں کی زبان ہے لہٰذا دوسری زبانوں والے اس سے مرعوب ہیں۔ جامعۃ الازہر اسلامی تعلیمات کا اعلیٰ ادارہ تھا جس سے متقی اور پرہیزگار عالم دین تیار ہو کر نکلتے تھے۔ انگریزی تعلیم آنے سے وہاں کے طلبہ بلکہ اساتذہ میں بھی تقویٰ اور اسلامی آداب کی بجائے مغربی تہذیب نمایاں نظر آتی ہے۔ اگر انگریزی علوم سیکھ کر دُنیوی ترقی حاصل کرنا اس لیے ہو کہ اس کے ساتھ دین اسلام کی ترویج و اشاعت میں مدد لیں گے تو ایسا کرنا درست' بلکہ ضروری ہے۔ مصنف عربی زبان کی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ دنیا میں دین اسلام غالب ہو اور اسلامی اخلاق کو عروج ملے۔

کتابچے کے آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک فکر انگیز تحریر بعنوان ''تحقیق انگریزی تعلیم'' شامل ہے جو دس مقدمات پر مشتمل ہے۔

❁❁❁

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah An-Nisa—cont....

(Ayaat 71-87, inclusive)

Translator's Note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap from the previous issue: verses 60 – 70:

The reader would recall that we had concluded our previous translation and elucidation of Surah An-Nisa (Women) at verse 70. The underlying message of those 11 verses was not merely a continuation of the charge sheet against the wicked and preposterous claims and deeds of the Munafiqun (hypocrites), rather it also summed up the various stages that the hypocrites go through until

they reach a point of no return, whereby their hearts (or minds) are sealed for good so much so that they become blind to all forms of Truth and are then hell-bent on rebelling against every command and edict set forth in the Qur'an and the Sunnah.

The verses also explained that the real cause of their plight is their personal ego along with the added influence of Satan and all other kinds of 'Taghut' (evil). When hypocrisy reaches that stage, then the hypocrite literally starts taking Allah (SWT) and His Messenger (SAW) as foes and at that juncture the intercession of even the most righteous does not do any good to them in the Court of Allah (SWT) and their final abode is thus destined to be the Hellfire.

The final section of those verses presented a simultaneous contrast in the shape of the believers and it was mentioned that those men (and women) who endeavor to emulate the sincerity in deeds of the Prophets (AS), The Truthful, The Martyrs and the righteously pious are the ones who are blessed with Allah's (SWT) bounty and for them are prepared the pleasures of Paradise.

Fresh Exposition: verses 71 through 87 of Surah An-Nisa.

Verse 71

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝

"O you who believe, be on your guard. March [to battle] in small groups or as one body."

In this ayah Allah (SWT) commands the believers to be ever on guard against the disbelievers by always being prepared to confront them in the battlefield, as and when needed. Then, as the occasion may require, they should advance towards their enemy in detachments i.e. on an expedition, as the Prophet (SAW) and the Muslims did after the Hijrah, or they should march all together in full formation.

Verse 72

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝

"Among you there is the sort of person who is sure to lag behind: if a calamity befalls you, he says, 'Allah has been gracious to me that I was not there with them.'"

This is the conduct of the hypocrites. They not only used to stay behind and refrain from accompanying those who fought for Allah's (SWT) cause, but also would discourage the believers from joining Jihad. If the Muslim army faced some temporary trials or were defeated by their enemy, the hypocrites would rejoice on their defeat and would consider it as Allah's (SWT) mercy and favor upon them that they did not join the Muslims for Jihad; otherwise they too would have suffered defeat.

Verse 73

وَلَئِنْ أَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ مَعَهُمْ فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا

"Yet he is sure to say, if you are victorious by Allah's favor, 'If only I had been with them, I could have made great gains,' as if there had been no ties of a?ection between you and him."

On the other hand, whenever the Muslim army returned victorious, along with the booty that Allah (SWT) bestowed on them, the hypocrites who stayed behind wished they would have been with them so that they could gather the worldly benefits and take possession of their share from the booty. This is because they do not have any love or friendship for the believers and their only aim and objective is the enjoyment and benefits of this world.

Verse 74

فَلْيُقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ اللَّهِ ٱلَّذِينَ يَشْرُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا بِٱلْءَاخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا

"Let those of you who are willing to trade the life of this world for the life to come, ?ght in Allah's way. To anyone who ?ghts in Allah's way, whether killed or victorious, We shall give a great reward."

Those who are ready to sacrifice their lives and their worldly desires to attain Allah's (SWT) pleasure, are the ones who owe the responsibility to fight in the way of Allah (SWT). Further, Allah (SWT) encourages the believers for Jihad for His (SWT) cause and guarantees them either martyrdom, in which case He (SWT) will admit them to Paradise or He (SWT) promises them victory over their enemies, so that they can enjoy whatever reward and booty they have gained.

Verse 75

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

"Why should you not ? ght in Allah's cause and for those oppressed men, women, and children who cry out, 'Lord, rescue us from this town whose people are oppressors! By Your grace, give us a protector and give us a helper!'"

When Prophet Muhammad (SAW) migrated to Madinah along with his companions (RAA), some of the poor Muslims did not migrate because they did not have the means to travel to Madinah, neither could they defend themselves from the persecution of the Quraysh. This group of Muslims including helpless children men and women prayed to Allah (SWT) to send for them a helper and save them from the oppressors. Therefore, Allah (SWT) encourages the believers in this ayah to fight for His (SWT) cause and deliver the oppressed Muslims (in all times to come) from their horrifying state.

Verse 76

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿٧٦﴾

"The believers ? ght for Allah's cause, while those who reject faith ? ght for the cause of evil. Fight the allies of Satan: Satan's strategies are truly weak."

Whenever there is a revolutionary movement, the society is polarized into two groups viz., Hizbullah (Allah's party) and Hizbushaitan (party of Satan). Those who believe in Allah (SWT) and the Last Day and fight in His way to attain His pleasure are from His party. On the other hand, those who disbelieve in Allah (SWT) and fight for the forces of evil are the friends of Satan. So Allah (SWT) commands the believers of His party to fight against the party of Satan. Surely the devils' cunning is weak indeed.

Verse 77

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ

النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۖ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۖ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ ۖ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا

"[O Prophet], do you not see those who were told, 'Restrain yourselves from ?ghting, perform the prayer, and pay the prescribed alms'? When ?ghting was ordained for them, some of them feared men as much as, or even more than, they feared Allah, saying, 'Lord, why have You ordained ? ghting for us? If only You would give us just a little more time.' Say to them, 'Little is the enjoyment in this world, the Hereafter is far better for those who are mindful of Allah: you will not be wronged by as much as the ? bre in a date stone."

Before the Hijrah the Muslims were being persecuted and tortured by the Quraysh in Makkah, and the Muslims demanded Prophet Muhammad (SAW) to give them permission to fight back. Instead of retaliation, they were commanded to observe patience and purify themselves by means of Prayer and Zakat. But afterwards, when the permission to fight was revealed, the hypocrites within them showed cowardice and feared their enemies i.e. the Quraysh, as they should have feared Allah (SWT) or even more than that, and they wished that the order of Jihad in the cause of Allah (SWT) be delayed, so that they enjoy the temporary things of this life for a few more days. On the other hand, Allah (SWT) says that those who have Taqwa will be admitted to Paradise in the Hereafter and no one will be wronged on that Day even in the least bit, as everyone will be rewarded according to what they earned in this life.

Verse 78

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَإِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۚ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا

"Death will overtake you no matter where you may be, even inside strong fortresses.' When good fortune comes their way, they say, 'This is from Allah,' but when harm befalls them, they say, 'This is from you [Prophet].' Say to them, 'Both come from Allah.' What is the matter with these people that they can barely understand what they are told?"

Firstly, the hypocrites are being reminded that even if you do not join Jihad, you will still taste death and nothing will save you from it even if you build strong and high fortresses. Secondly, Allah (SWT) admonishes them for their wrong attitude towards the Prophet (SAW). Whenever Allah (SWT) gave them success and victory, they became happy and said, 'this is from Allah (SWT)'. But when Allah (SWT) tested them with some calamity or they suffered defeat, then they would blame the Prophet (SAW) for it, without accepting the responsibility for their own misgivings and refusal to act as they had been instructed. The verse continues on to decree that *all* events are from Allah (SWT), either made to occur in order to put people to trial or to simply punish them for wrongdoings, but the hypocrites lack the insight to comprehend this philosophy.

Verse 79

مَآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ ٱللَّهِ ۖ وَمَآ أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَٰكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ شَهِيدًا ۝

"Anything good that happens to you (O Prophet) is from Allah; anything bad is [ultimately] as a consequence of your own action, from your own selves (O Muslims). We have sent you (O Muhammad) as a messenger to people; Allah is su? cient witness."

This means that whatever success or victory Muslims enjoy is from Allah (SWT) alone, but whatever loss is suffered is due to the actions and errors of Muslims owing to their disregard for the orders of Allah (SWT) and His Messenger (SAW). Moreover, the verse explains that Prophet Muhammad's (SAW) duty is only to convey the message and instructions from Allah (SWT) to the people and he is not answerable for their wrong actions and evil deeds. Furthermore, it also implies that Allah (SWT) is a witness that Muhammad (SAW) has conveyed the message he was entrusted with. Allah is (your) all-sufficient witness.

Verse 80

مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝

"Whoever obeys the Messenger obeys Allah. If some pay no heed, We have not sent you to be their keeper."

This ayah again emphasizes the importance of following the Sunnah of Prophet Muhammad (SAW) in all aspects of life and criticizes those who turn away from his (SAW) Sunnah. It also reiterates that the function of the Prophet is merely to invite people to Islam while their acceptance or otherwise is in the Hands of Allah (SWT).

Verse 81

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾

"They say, 'We obey you,' but as soon as they leave your presence, some of them scheme by night to do other than what you said. Allah records what they scheme, so leave them alone, and put your trust in Allah: He is su? cient protector."

This again refers to the attitude of the hypocrites who declared their obedience when they were in Prophet's (SAW) presence, but as soon as they left him, some of them met secretly at night and planned against what he (SAW) had said. But they are ignorant of the fact that Allah (SWT) knows everything and He warns them that He records all their plots, which will be shown to them in the Hereafter. Therefore the believers are told to ignore them and forgive them and not to fear them.

Instead have faith and trust in Allah (SWT) who is sufficient for all as a Helper and Protector.

Verse 82

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾

"Will they not think about this Qur'an? If it had been from anyone other than Allah, they would have found much inconsistency in it."

The main cause of the deviation of the hypocrites from the right path is that they do not ponder on this Qur'an, because they did not believe that it is from Allah (SWT). Therefore, they are being admonished to use their reason and objective judgment, for they will surely come to the conclusion that the Qur'an is a book from Allah (SWT), free from all human conjectures and discrepancies and if it

would have been from any other than Allah (SWT) then it would have many inconsistencies in it.

Verse 83

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ ٱلْأَمْنِ أَوِ ٱلْخَوْفِ أَذَاعُوا۟ بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى ٱلرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ ٱلَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَٱتَّبَعْتُمُ ٱلشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

"Whenever news of any matter comes to them, whether concerning peace or distress, they spread it about; if they referred it to the Messenger and those in authority among them, those seeking its meaning would have found it out from them. If it were not for Allah's bounty and mercy towards you, you would almost (except for a few) all have followed Satan."

In this ayah Allah (SWT) commands the Muslims to refrain from spreading rumors from unreliable sources before investigation. *(Translator's Note: Today's media is an apt example of such unreliability.)* In times of distress, the hypocrites of Madinah and the enemies of Islam would spread rumors and unreliable news to frighten and cause needless harm to the Muslims. Thus Allah (SWT) warns such mischief makers and commands them to refrain from spreading rumors. Instead they are commanded to report any news coming from unknown sources to the Messenger (SAW) or those who are in authority, so that they would investigate it and draw the right conclusions. In fact it is Allah's (SWT) grace and mercy that He protects the Muslims from the plots and schemes of their enemies, otherwise they too would have followed the footsteps of Satan except a few of them.

Verse 84

فَقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى ٱللَّهُ أَن يَكُفَّ بَأْسَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنكِيلًا ﴿٨٤﴾

"So [O Prophet] ? ght in Allah's way. You are accountable only for yourself. Urge the believers on. Allah may well curb the power of the disbelievers, for He is stronger in might and more intense in punishment."

Allah (SWT) commands His Prophet (SAW) to fight for the cause of

Allah (SWT), even if no one else is ready to accompany him (SAW) in his mission. *(Translator's Note: which did not happen as history is evident to the great numbers of believers that stood shoulder to shoulder with the Messenger (SAW) in his mission. That part of the verse in fact serves as a general rule for Prophethood.)* And do not be concerned about those who do not join you to fight in Allah's way as you will only be held responsible for yourself and not for their deeds and actions. This was also the case of the followers of Prophet Moses (AS), when he asked his people to fight in Allah's (SWT) cause and recapture the holy lands occupied by the enemies of Allah (SWT). But they refused to fight and thus Moses (AS) said: "O my Lord! I have no control over anyone except myself and my brother. Please, set us apart from these disobedient people." *(Al-Maida, 5:25)*

Furthermore, Allah (SWT) commands His Prophet (SAW) to urge and motivate the believers to fight along with him (SAW) for the cause of Allah (SWT).

Moreover, Allah (SWT) gives assurance to the Muslims that He (SWT) will overthrow the might of the disbelievers by giving strength and courage to the Muslims to defend Islam. And surely Allah's Might, Power and Authority are stronger than that of any so-called rival and His (SWT) punishment is much greater and effective.

Verse 85

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا

"Whosoever speaks for a good cause will share in its bene? ts and whosoever speaks for a bad cause will share in its burden: Allah controls everything."

The verse implies that whoever pleads or recommends for a good cause, he will have his share in its blessings, but those who plead for an evil cause, they will have their share of punishment in the Hereafter. This ayah also strictly warns the Muslims not to plead on behalf of those who support a bad cause even if they are friends or relatives. Allah (SWT) is a witness over everything and He (SWT) controls all things.

Verse 86

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾

"And when you [believers] are o?ered a greeting, respond with a better one, or at least return it: Allah keeps account of everything."

According to this ayah and the Sunnah of the Prophet (SAW), if a Muslim greets his brother he should return the greeting equally which is an obligation on him, but it is recommended to say a better greeting e.g. if a Muslims greets his brother by saying, Assalam-o-Alaikum (Peace be upon you), he should return the greeting equally by repeating the same words or greet him with a better greeting and say, Assalam-o-Alaikum-wa-Rahmatullah (Peace and Blessings be upon you). As far as the non-Muslims are concerned, the Sunnah of the Prophet (SAW) clearly indicates that a Muslim should not initiate the greeting with them, but if they greet the Muslims, then they should return the greeting politely and respectfully without adding anything to it. The verse finishes on a familiar note, as Allah (SWT) says that whatever people think or do, He (SWT) is aware of everything and He (SWT) keeps count of all things.

Verse 87

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿٨٧﴾

"He is Allah: there is no god but Him. He will gather you all together on the Day of Resurrection, about which there is no doubt. Whose word can be truer than Allah's?"

The verse gives the basic message of 'Tauhid', i.e., The Oneness of God. Allah (SWT) says that He (SWT) is the only Lord of the whole creation and has no partner whatsoever. He (SWT) sustains the whole universe and He (SWT) will gather all mankind on the Days of Resurrection and Judgment which are surely to come. The verse ends by citing the ultimate Truthfulness of the promise regarding Allah's (SWT) statement that the Day of Judgment has to come and there is no doubt about it.

And Allah *(SWT)* Knows Best!

Quarterly **HIKMAT-E-QURAN** Lahore
Jan. - Mar. 2015 Vol.33 No.1

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمت کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ